www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

August 2001 • No. 297

دوسروں کی شکایت صرف اپنی نااہلی کا اعلان ہے۔

حل کی طرف

موجودہ حالت میں پاکستان کے لئے جو انتخاب (choice) ہے وہ جمہوری حکومت اور فوجی حکومت کے درمیان نہیں ہے بلکہ حقیقی انتخاب جن دو حالتوں کے درمیان ہے وہ یہ کہ پاکستان کا سفر جس بندگلی (impasse) پر آکر رک گیا ہے وہاں سے وہ اپنے آپ کو نکال کر اپنا سفر دوبارہ شروع کرے یا وہ اسی بندگلی میں بدستور پڑا رہے۔ یہاں تک کہ وہ قوموں کے عالمی روڈ میپ سے غیر موجود ہو جائے۔

کسی قوم کی زندگی میں بعض اوقات ایسا لمحہ آتا ہے جب کہ قوم کا ترقیاتی سفر رک جاتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ ایک جرأت مندانہ فیصلہ کیا جائے تاکہ دوبارہ قوم کا سفر معتدل انداز میں جاری ہو سکے۔ اس قسم کا نازک فیصلہ اکثر اوقات عوامی جذبات کے خلاف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا جرأت مندانہ فیصلہ اکثر ایسے افراد کرتے ہیں جو فوجی حکمراں کی حیثیت رکھتے ہوں۔ جمہوری حکمراں اس قسم کا جرأت مندانہ فیصلہ نہیں لے سکتا۔ کیوں کہ وہ عوام کی رایوں سے چن کر حکومت تک پہنچتا ہے، اس بنا پر اس کے لئے ایسا کوئی انقلابی فیصلہ لینا ناممکن ہو جاتا ہے جو عوامی احساسات سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

یہاں میں اس نوعیت کی دو مثالیں پیش کروں گا۔ مسلم تاریخ میں اس کی ایک مثال صلاح الدین ایوبی (وفات ۱۱۹۳ء) کی ہے۔ صلاح الدین کا یہ عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے صلیبی قوموں کی فوجی یلغار سے مسلم دنیا کو بچایا۔ مگر صلاح الدین کو یہ طاقتور حاکمانہ حیثیت کیسے ملی جب کہ وہ اپنا یہ عظیم رول ادا کر سکے۔ جیسا کہ معلوم ہے، صلاح الدین ایوبی مصر کے سلطان نورالدین زنگی کا ایک فوجی افسر تھا۔ سلطان نورالدین کی موت کے بعد اگر چہ اس کے بیٹے موجود تھے، لیکن صلاح الدین نے حکومت پر قبضہ کر کے سلطان کا منصب حاصل کرلیا۔ مسلم مورخین نے عام طور پر صلاح الدین کے اس قبضہ کی کارروائی کو جائز قرار دیا ہے۔ کیوں کہ یہ قبضہ اگر چہ بظاہر غیر آئینی تھا لیکن اپنے نتیجہ کے اعتبار

سے وہ ایک عظیم سیاسی فائدہ کا سبب بنا۔ اسی نے صلاح الدین ایوبی کے لئے اس امر کو ممکن بنایا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے اپنا وہ عظیم کردار ادا کر سکے جو کہ اس نے اس کے بعد ادا کیا۔

دوسری مثال فرانس کے چارلس ڈیگال (وفات ۱۹۷۰) کی ہے۔ وہ فرانس کی فوج میں ایک جنرل تھا۔ اس کے بعد اس نے حالات سے فائدہ اٹھا کر فرانس کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ بظاہر یہ ایک غیر جمہوری عمل تھا مگر فرانس کی نجات کے لئے ڈیگال نے ایک ایسا کام کیا جو کوئی جمہوری حکمراں نہیں کر سکتا تھا۔

کیوں کہ جو حکمراں عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آئے وہ عوامی جذبات کو نظر انداز کر کے کوئی جرأت مندانہ فیصلہ نہیں لے سکتا۔ جب کہ بعض حالات میں کسی قوم کی نجات کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ عوامی جذبات کو نظر انداز کر کے ایک جرأت مندانہ فیصلہ لیا جائے۔

جیسا کہ معلوم ہے، اس وقت فرانس نے افریقہ کے کئی ملکوں مثلاً الجزائر وغیرہ پر قبضہ کر رکھا تھا اور ان کو فرانس کے صوبے (provinces) کہتا تھا۔ یہ غیر حقیقت پسندانہ پالیسی فرانس کے لئے اتنی زیادہ مہلک ثابت ہوئی کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جاری ہونے والی ترقیاتی دوڑ میں وہ یورپ کا ایک ''مرد بیمار'' بن گیا۔ ڈیگال نے قومی جذبات سے الگ ہو کر اس مسئلہ پر غور کیا۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ افریقہ کی فرانسیسی کالونیوں کو یک طرفہ طور پر آزاد کر دیا جائے۔ یہ اقدام فرانس کے عوام کے جذبات کے سراسر خلاف تھا مگر یہی وہ غیر مقبول فیصلہ ہے جس نے فرانس کو جدید ترقیاتی دوڑ میں ایک بڑی طاقت کی حیثیت دے دی۔

پاکستان کی موجودہ صورت حال بھی عین یہی ہے۔ کشمیر کے سوال پر انڈیا کے خلاف پاکستان کی بلا اعلان جنگ (undeclared war) نے پاکستان کو اتنا زیادہ نقصان پہنچایا ہے کہ وہ اپنی تباہی کے آخری کنارہ پر پہنچ چکا ہے۔ دنیا اس کو سب سے زیادہ غیر محفوظ ملک (unsafest country) کے طور پر دیکھتی ہے۔ عالمی مالیاتی ادارے پاکستان میں سرمایہ کاری (investment) کے لئے تیار نہیں۔ پاکستانی عوام کی بے چینی نے ملک میں خانہ جنگی (civil war) جیسی صورت حال پیدا کر دی ہے۔ ملک

کے مذہبی اور تعلیمی اور ثقافتی ادارے تخریبی سرگرمیوں کے مرکز بن گئے ہیں۔

ان خرابیوں کا سب سے زیادہ اندوہناک انجام وہ ہے جس کو برین ڈرین (brain drain) کہا جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اس لئے کسی ملک کی ترقی کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ وہاں لوگوں کو عمل کے کھلے مواقع دکھائی دیتے ہوں۔ مثلاً وہاں امن ہو، بہترین انفراسٹرکچر (infrastructure) ہو۔ آدمی کو اپنی محنت کا پورا صلہ ملتا ہوا نظر آئے۔ اگر کسی ملک میں یہ مواقع پوری طرح موجود ہوں تو اس ملک میں ہر آدمی اپنے آپ سرگرم ہو جائے گا اور ملک خود بخود ترقی کرنے لگے گا۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان میں ایسا نہ ہوسکا۔ پاکستان میں ''پہلے صورت موجودہ (statusquo) کو بدلو' کے نظریہ کے نتیجہ میں مسلسل طور پر ہنگامی صورت حال باقی ہے۔ وہاں عملی طور پر افراد کے لئے حسب حوصلہ کام کے مواقع تقریباً ختم ہوگئے ہیں۔ چنانچہ بیشتر حوصلہ مند اور باصلاحیت افراد پاکستان چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ امریکہ کے سفروں کے دوران میں نے امریکہ میں مقیم بہت سے پاکستانیوں سے پوچھا کہ آپ اپنے ملک کو چھوڑ کر یہاں کیوں آگئے۔ تقریباً سب کا ایک ہی جواب تھا کہ امریکہ میں کام کے مواقع ہیں جب کہ پاکستان میں کام کے مواقع نہیں۔

کشمیر کے بارے میں پاکستان کی غیر حقیقت پسندانہ پالیسی پاکستان کے ترقیاتی سیلاب کے لئے ٹریپ ڈور (trap door) بنی ہوئی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان موجودہ زمانہ میں ترقیاتی دوڑ میں پچھڑ گیا ہے۔ پاکستان کو اس پچھڑے پن سے نکالنے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان مسائل سے ٹکرانے کے بجائے مواقع کو استعمال (avail) کرنے کی پالیسی اختیار کرے۔ موجودہ حالات میں اس کی عملی صورت یہ ہے کہ پاکستانی لیڈر کشمیر کے معاملہ میں صورت موجودہ (statusquo) کو علیٰ حالہٖ ماننے پر راضی ہوجائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کشمیر میں قبضہ کی لائن (LoAC) کو کچھ ضروری ایڈجسٹمنٹ کے ساتھ دونوں ملکوں کے درمیان تسلیم شدہ سرحد قرار دے دیا جائے۔ اس معاملہ میں ہندستان اور پاکستان کے درمیان جو جغرافی اور سیاسی اسٹیٹس کو (political statusquo) بن گیا ہے اس کو مان کر اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اپنی اس

رائے کو میں ۱۹۶۸ سے برابر پیش کر رہا ہوں۔ مزید یہ کہ اس طرح کا انقلابی فیصلہ صرف ایک غیر جمہوری حکمراں ہی کر سکتا ہے۔ کسی جمہوری حکمراں کے لیے ایسا غیر جذباتی فیصلہ لینا ممکن نہیں۔

میرے نزدیک صدر پرویز مشرف کے لیے یہی تاریخی کام مقدر ہے۔ اس معاملہ میں جو لوگ صدر مشرف کے حق اقتدار پر سوال اٹھا رہے ہیں ان کا جواب سابق فوجی صدر محمد ضیاء الحق کی مثال میں موجود ہے۔ اس سے پہلے جنرل محمد ضیاء الحق نے یہی کیا تھا کہ پاکستان کے اقتدار پر فوجی قبضہ کیا۔ اور پھر خود ساختہ کارروائی کے ذریعہ اپنے صدر مملکت ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس وقت پاکستان کے اسلام پسندوں سے لے کر امریکہ کے محکمۂ خارجہ تک ہر ایک نے اس کو قبول کر لیا اور قانونِ ضرورت (law of necessity) کے تحت اس کو جائز قرار دیا۔ یہ نظیر کافی ہے کہ صدر پرویز مشرف کو بھی اسی دلیل کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ یہ ایک منافقانہ کردار ہے کہ جہاں ذاتی انٹرسٹ دکھائی دے وہاں آدمی پریکٹیکل بن جائے اور جہاں ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ نہ ہو وہاں وہ آئیڈیلزم کی بات کرنے لگے۔

پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کا اقتدار سنبھالنا اور پھر ۲۰ جون ۲۰۰۱ کو ملک کے صدر کی حیثیت سے حلف لینا بظاہر ایک غیر آئینی واقعہ ہے مگر میرے نزدیک وہ ایک بالکل بروقت واقعہ ہے۔ موجودہ صورت حال میں پاکستان کو جو جرأت مندانہ فیصلہ لینا ہے وہ صدر پرویز مشرف جیسا فوجی حکمراں ہی لے سکتا ہے۔ انتخابات کے ذریعہ بننے والے کسی جمہوری حکمراں کے لئے ایسا غیر جذباتی فیصلہ لینا ممکن ہی نہیں۔

اس مسئلہ کا واحد علاج یہ ہے کہ پاکستان اپنی جذباتی پالیسی کو چھوڑ کر حقیقت پسندانہ پالیسی اختیار کرے۔ وہ کشمیر کے سوال پر ہندستان سے سمجھوتہ کر لے تاکہ ملک میں امن کی فضا پیدا ہو اور ملکی ذرائع کو تعمیری سرگرمیوں کی طرف موڑا جا سکے۔

پچھلے ۵۵ سال سے پاکستان کی سیاست ایک ہی سوال پر مرتکز رہی ہے۔ اور وہ ہے — کشمیر میں قائم شدہ سیاسی حالت (political statusquo) کو بدلنا۔ اب آخری طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ پالیسی ایک تباہ کن پالیسی ہے۔ وہ سرے سے کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرنے والی

ہی نہیں، نہ ماضی اور حال میں اور نہ ہی مستقبل میں۔

مذکورہ قسم کا انقلابی فیصلہ لینا یقینی طور پر ایک مشکل کام ہے۔ لیکن اگر ایک بار ہمت کرکے پاکستان ایسا فیصلہ لے لے تو اس کے معجزاتی نتیجے برآمد ہوں گے۔ انڈیا کے خلاف بلا اعلان جنگ کی حالت ختم ہوکر امن قائم ہو جائے گا۔ پاکستانی قوم کی منفی سوچ مثبت سوچ میں تبدیل ہو جائے گی۔ باہمی تجارت کے دروازے کھل جائیں گے۔ تعلیم اور ثقافت اور سیاحت کے میدان میں دونوں ملکوں کے درمیان لین دین شروع ہو جائے گا۔ لٹریچر کی دوطرفہ آمد ورفت کے نتیجہ میں دونوں ملکوں کے درمیان غلط فہمیاں ختم ہو جائیں گی اور برادرانہ ماحول قائم ہو جائے گا۔ انڈیا اور پاکستان کی زبان اور کلچر بڑی حد تک ایک ہے۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے لئے دور کے پڑوسی (distant neighbours) بنے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہوگا کہ دونوں قریب کے پڑوسی بن جائیں گے جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب بھی کوئی فرد یا قوم کام کرنا چاہے تو اس وقت پیشگی حالات کے نتیجہ میں ایک عملی صورت حال (statusquo) موجود رہتی ہے۔ اب سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے موجودصورت حال (statusquo) کو بدلا جائے تاکہ عمل کرنے کے راستے پیدا ہوں۔ دوسرے یہ کہ موجودصورت کو اپنے حال پر چھوڑتے ہوئے بقیہ ممکن میدانوں میں اپنا عمل جاری کرنا۔

یہ طریقہ جس کو میں مثبت اسٹیٹس کوازم (positive statusquoism) کہتا ہوں، یہی عقل کے مطابق ہے۔ یعنی جب آئیڈیل کا حصول ممکن نہ ہو تو پریکٹیکل پر راضی ہو جانا۔ خود اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ **الصلح خیر** (النساء ۱۲۸)۔ یعنی نزاعی معاملات میں سب سے زیادہ بہتر اور مفید پالیسی سمجھوتہ کی پالیسی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اختلافی مواقع پر ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر مصالحت کا طریقہ اختیار کرنا۔

اسٹیس کو (statusquo) کو مانتے ہوئے تعلقات کو مستقل بنیاد پر استوار کرنے کی یہ تجویز کوئی نئی نہیں۔ جواہر لال نہرو کے زمانہ میں دونوں طرف کی حکومتیں مبینہ طور پر اس تجویز پر راضی ہو چکی

تھیں۔ حتی کہ شیخ محمد عبداللہ دونوں کے بیچ میں ایک درمیانی آدمی کے طور پر پاکستان پہنچ چکے تھے۔ مگر نہرو کی اچانک موت سے اس تاریخ ساز منصوبہ پر عمل درآمد نہ ہو سکا:

> By 1956, Nehru had publicly offered a settlement of Kashmir with Pakistan over the ceasefire line (now converted into the LoC). On May 23, 1964, Nehru asked Sheikh Abdullah to meet Ayub Khan in Rawalpindi in an effort to resolve the Kashmir imbroglio······the Pakistani leader agreed to a summit with Nehru, to be held in June 1964. This message was urgently telegraphed to Nehru on May 26. But just as Nehru's consent reached Karachi, the world also learnt that Nehru had died in his sleep. And with that a major opportunity for a peaceful solution over Kashmir was also lost. (*The Hindustan Times,* June 18, 2001)

پاکستان اگر ایسا کرے کہ کشمیر کے بارے میں صورت موجودہ (statusquo) پر رضامند ہو کر اس کو مستقل بندوبست کے طور پر قبول کر لے تو اس میں پاکستان کا یا وسیع تر معنوں میں ملت مسلمہ کا کوئی نقصان نہیں۔ کشمیر کا علاقہ پاکستان سے جدا ہونے کے بعد بھی بدستور ایک مسلم خطہ کے طور پر اپنی جگہ باقی رہے گا۔ پھر اس میں آخر نقصان کی کیا بات۔ مزید یہ کہ تجربہ بتاتا ہے کہ برصغیر ہند کے جو مسلمان انڈیا سے جڑے انہوں نے پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے بہت زیادہ ترقی کی۔ اس ترقی کی ایک علامت یہ ہے کہ آج نہ صرف برصغیر ہند بلکہ پوری مسلم دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند تاجر ہندستان کا ایک مسلمان ہے جو بنگلور میں رہتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ پاکستان کا ہندستان سے مصالحت کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اپنے طاقت ور پڑوسی سے نزاع کو ختم کرنا ہے۔ اور اپنے پڑوسی سے نزاع کو ختم کرنا گویا اپنے اوپر ہر قسم کی ترقی کے دروازے کھولنا ہے۔ اپنے حریف سے نزاع کو ختم کرنا کس طرح ترقی کا زینہ بنتا ہے، اس کی ایک مثال موجودہ جاپان ہے۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے جاپان اور امریکہ ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ جنگ کے بعد جاپان نے امریکہ سے مکمل مصالحت کر لی۔ اس مصالحت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان عالمی نقشہ میں اقتصادی سپر پاور بن کر ابھر آیا۔

پاکستان اپنی موجودہ پالیسی سے اسلام کی بدنامی کا سبب بن رہا ہے۔ اپنی موجودہ پالیسی کی بنا پر پاکستان کو یہ کرنا پڑا کہ اس نے انڈیا سے نفرت کو اپنے لیے اتحاد کا ذریعہ بنایا۔ اس غلط پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان (بشمول مشرقی پاکستان) کے لوگ اسلام کے نام پر تو متحد نہ ہو سکے مگر انڈیا سے نفرت کے نام پر وہ مکمل طور پر متحد نظر آتے ہیں۔ اس مثال کی بنا پر دنیا کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اسلام کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ مسلمانوں کو باہم متحد کر سکے۔ اسی ذہن کی ترجمانی دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۱۸ جون ۲۰۰۱ء) کے ایک مضمون میں اس طرح کی گئی ہے کہ اسلام پاکستان کو متحد نہ کر سکا، مگر ہندستان دشمنی نے اس کو متحد کر دیا:

Islam does not hold Pakistan together anymore, but anti-Indianism does.

پاکستان کی مصالحانہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اہل پاکستان کے اندر نیا مثبت ذہن فروغ پائے گا۔ اس کے بعد اہل پاکستان ایک نئے دور میں داخل ہو جائیں گے جب کہ ان کے قومی اتحاد کی بنیاد اینٹی انڈیا ذہن نہ ہو بلکہ ان کے قومی اتحاد کی بنیاد پرو اسلام (pro-Islam) ذہن ہو جائے۔ یہ فائدہ اتنا عظیم ہے کہ عجب نہیں کہ اس کے بعد پاکستان کے اوپر اللہ کی رحمت کے تمام دروازے کھل جائیں اور اس کی رحمت کا کوئی دروازہ ان کے اوپر بند نہ رہے۔

پنجاب کا سفر

ایک آل انڈیا کلچرل تنظیم ہے جو اپنے مخفف نام اسپک میکے (Spic Macay) سے مشہور ہے۔اس کی دعوت پر پنجاب کا سفر ہوا۔ ۱۴ ستمبر ۲۰۰۰ کی صبح کو سورن شتابدی اکسپریس کے ذریعہ دلّی سے روانہ ہو کر پہلے امرتسر پہنچا جو کہ دہلی سے ساڑھے چار سو کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں سے اگلے دن جالندھر کے لئے بذریعہ ٹرین روانگی ہوئی۔ جالندھر سے دوبارہ ۱۶ ستمبر کی شام کو شتابدی اکسپریس سے روانہ ہو کر دہلی واپس آیا۔ اس سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

سفر سے کچھ پہلے دہلی کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ نے ۱۲ ستمبر ۲۰۰۰ کا ٹائمس آف انڈیا دیکھا ہے۔ میں نے پوچھا، کیا اس میں کوئی خاص بات ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے صفحۂ اول پر پرائم منسٹر اٹل بہاری واجپئی کے بارے میں ایک رپورٹ ہے۔ اس کو آپ ضرور پڑھیں۔ اتفاق سے میں اس پرچے کو پڑھ نہیں سکا تھا۔ مذکورہ ٹیلی فون کے بعد میں نے اس کو لے کر پڑھا۔ یہ رپورٹ اخبار کے صفحۂ اول پر مندرجہ ذیل عنوان کے تحت چھپی ہے:

The Sangh is his 'soul'.

اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ مسٹر اٹل بہاری واجپئی نے مئی ۱۹۹۵ میں آرگنائزر میں لکھا تھا کہ آر ایس ایس دو مقاصد کے تحت قائم کی گئی۔ ایک، ہندوؤں کو منظّم کرنا۔ دوسرے یہ کہ غیر ہندوؤں مثلاً مسلمانوں اور عیسائیوں کو دیش کی مین اسٹریم (قومی دھارے) میں شامل کرنا۔ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق اپنے مذہب پر عمل کر سکتے ہیں۔ مگر یہ ضروری ہے کہ اس ملک کے لئے حب الوطنی کا جذبہ ان کے اندر موجود ہو۔ (انہوں نے مزید کہا کہ) مسلمانوں کو ابھی یہ فن سیکھنا ہے کہ جس ملک میں وہ اقلیت میں ہیں وہاں وہ کس طرح رہیں اور ترقی کریں۔ قرآن اس سلسلہ میں کوئی رہنمائی نہیں دیتا:

The RSS has a two fold task. One is to organize the Hindus. The other is to assimilate the non-Hindus like Muslims and Christians in the main stream. They can follow the faith of their own conviction, but they must have a feeling of patriotism for this

country...Muslims have yet to learn the art of existing and flourishing in a country where they are in a minorty. The Quran offers no guidance in this regard.

''سنگھ'' کے لوگوں کا یہ احساس کیوں ہے کہ اس ملک کے مسلمان محبّ وطن نہیں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں مبنی بر وطن قومیت (Home-land based nationality) کا اصول رائج ہوا۔ یہ اصول اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے بالکل فطری تھا اور وہ بلاشبہہ مسلمانوں کے لئے بھی اسی طرح قابل قبول تھا جس طرح وہ دوسروں کے لئے قابل قبول ہے۔

مگر یہاں ایک اور مسئلہ پیدا ہوگیا۔ وہ یہ کہ کچھ انتہا پسند ہندو دانشوروں نے حب الوطنی کی ایک خودساختہ تشریح کی۔ انہوں نے کہا کہ حب الوطنی کا صحیح جذبہ صرف اس وقت پیدا ہوسکتا ہے جب کہ وطن کو معبود کا درجہ دے کر اس کو قابل پرستش سمجھا جائے۔ اس قسم کے انتہا پسند مفکرین خود یورپ میں بھی پیدا ہوئے۔ یہی کچھ انتہا پسند مفکرین تھے جن کو غلط طور پر جنرلائز کر کے اقبال نے اپنی مشہور نظم میں کہا تھا کہ تہذیب جدید کے آذر نے کچھ نئے صنم ترشوائے ہیں:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس مسئلہ کا حل منفی احتجاج نہیں۔ اس مسئلہ کا درست حل یہ ہے کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ مبنی بر وطن قومیت کا نظریہ بالکل درست اور فطری ہے۔ مگر یہ قومیت وطن کی فطری محبت پر قائم ہوتی ہے نہ کہ وطن کی پرستش پر جو سراسر غیر فطری اور غیر عملی ہے۔

سورن شتابدی اکسپریس ٹھیک اپنے وقت پر نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہوگئی۔ میں اس کے ایگزیکٹیو کلاس میں داخل ہوا۔ یہ تقریباً اسی قسم کی ایک کوچ تھی جو میں نے اس سے پہلے یورپ کی ٹرینوں میں دیکھی تھی۔ اس کے اندر زیادہ تر خوش حال طبقہ کے لوگ سفر کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا تو ہر مسافر کے چہرہ پر فخر اور شادمانی کے جذبات نمایاں تھے۔ کوئی آرام دہ سیٹ کے اوپر بے فکری کے ساتھ دراز تھا۔ کوئی اپنے سیلولر ٹیلی فون پر فاتحانہ لہجہ میں اپنے کسی دوست سے بات کر رہا تھا۔ کوئی ہنس ہنس کر اپنے ساتھی کے ساتھ گفتگو میں مشغول تھا۔ ان مناظر کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا

جیسے ہر آدمی زبان حال سے یہ کہہ رہا ہو کہ یہ جو کچھ مجھے ملا ہے یہ کسی اور کا عطیہ نہیں۔ یہ میں نے خود اپنی محنت اور اپنی صلاحیت سے حاصل کیا ہے۔ گویا وہی نفسیات جو قارون کی زبان سے قرآن میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے: إنما اوتيته على علم عندي (القصص ۷۸)

یہ مناظر دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ میں نے کہا کہ لوگ حقیقت سے کتنا زیادہ دور ہیں۔ جو چیز سراسر خدا کا عطیہ ہے اس کو وہ اپنی ذاتی ملکیت سمجھ رہے ہیں۔ جن چیزوں کو پاکر کے انہیں شکر خداوندی کے احساس میں غرق ہوجانا چاہئے تھا اس سے وہ صرف فخر اور برتری کی غذا لے رہے ہیں۔ یہ بلاشبہہ انسان کی سب سے بڑی محرومی ہے۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا مشن یہ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کی حکومت قائم کریں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا کی حکومت بروقت ہی کامل طور پر قائم ہے اور مومن وہ ہے جو خدا کی اس قائم شدہ حکومت کا اعتراف کر کے اس کے آگے آزادانہ طور پر سرنڈر کر دے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کی اس قائم شدہ حکومت کا متقیانہ شہری بنا لے۔ اسی اختیاری اطاعت کا دوسرا نام ایمان ہے۔ کوچ کے اندر اس کے عملہ کی طرف سے مسافروں کو ایک فارم دیا گیا۔ اس فارم پر مسافر کو اپنا سفری تجربہ درج کرنا تھا۔ اس مطبوعہ فارم کے اوپر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Your comments help us to serve you better.

میں نے اپنے تبصرہ میں کھانے اور سروس وغیرہ کے بارے میں تعریفی الفاظ لکھے۔ فارم میں ایک خانہ تجویز (suggestion) کا تھا۔ سفر کے دوران واحد جو چیز میرے لئے تکلیف دہ ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ اس ایگزیکٹیو کوچ کو انہوں نے مکمل طور پر ائر کنڈیشنڈ کر کے مسافروں کو باہر کے شور سے تو محفوظ کر دیا تھا مگر اس کے اندر میوزک کے نام پر گانا اور باجا سنایا جا رہا تھا جو میرے نزدیک خود بھی شور کے ہم معنیٰ تھا۔ چنانچہ میں نے تجویز کے خانہ میں فارم میں یہ الفاظ لکھ دئے:

The loud music in the coach was very disturbing. For me it was nothing but noise polution. Either you must put a stop to it or arrange for headphones as in aeroplane.

ہماری ٹرین پنجاب کے میدانوں میں دوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ کوچ میں دونوں طرف لگے ہوئے بڑے بڑے سفید شیشوں کے ذریعہ باہر کی دنیا صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ہرے بھرے درختوں کے مسلسل جھنڈ اور اس کے پیچھے جگہ جگہ نئے طرز کی بنی ہوئی خوبصورت عمارتیں، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ مساكن طيبةً في جنات عدن (الصّف ۱۲) کا منظر بہت دور سے دکھایا جا رہا ہو۔ موجودہ زمانہ میں جو خوشنما مادی ترقیاں ظہور میں آئی ہیں وہ بہت سے لوگوں کے اندر صرف مادی حرص کا جذبہ جگاتی ہیں۔ مگر میں جب ان کو دیکھتا ہوں تو میری زبان پر یہ الفاظ آجاتے ہیں ـــــــ آخرت کی جنت کا بعید تعارف۔

کوچ کے اندر پڑھنے کے لئے انگریزی اخبارات دئے گئے۔ میں نے ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) کا شمارہ ۱۴ ستمبر ۲۰۰۰ دیکھا۔ اس کے صفحۂ اول پر یہ خبر تھی کہ مائیکروسافٹ کا چیف اور دنیا کا امیر ترین آدمی بل گیٹس (Bill Gates) ۱۳ ستمبر ۲۰۰۰ کو ہندستان آیا ہے۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ بل گیٹس بے حد مصروف زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنا ایک ایک منٹ استعمال کرتے ہیں۔ جب وہ نئی دہلی پہنچے تو شیریٹن ہوٹل میں ایک ایلویٹر (Elevator) ان کے لئے پیشگی طور پر ریزرو رکھا گیا تھا تاکہ جب وہ یہاں پہنچیں تو اپنا ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فوراً وہ اوپر اپنے اسپیشل روم میں پہنچ سکیں۔

پنجاب زرعی اعتبار سے ہندستان کی سب سے زیادہ خوشحال ریاست ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ ۱۸۵۷ کے غدر (Mutiny) میں پنجاب کے سکھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اور انہیں کامیاب بنانے میں خصوصی مدد دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کا کنٹرول جب انڈیا پر قائم ہو گیا تو انہوں نے پنجاب کو بہت زیادہ نوازا۔ یہاں زرعی آبپاشی کے لئے کثرت سے نہریں نکالی گئیں۔ چھوٹی اقلیت کے باوجود سکھوں کو فوج میں ۳۳ فیصد تک جگہ دی گئی۔ آزادی کے بعد جب ہندستان کے لوگ دوبارہ برطانیہ جانے لگے تو سکھوں کے لئے برطانیہ کے دروازے خصوصی طور پر کھول دئے گئے، وغیرہ۔

راستہ میں ہماری ٹرین انبالہ سے گزری۔ انبالہ کے ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کچھ دیر کے لئے رکی تو مجھے یاد آیا کہ تقریباً ۳۰ سال قبل میں پہلی بار انبالہ آیا تھا۔ اور یہاں وقف بورڈ کے دفتر میں کچھ دیر ٹھہرا تھا۔ اس سفر کا مختصر تذکرہ اسی زمانہ میں الجمعیۃ ویکلی میں شائع ہوا تھا۔

یکم اکتوبر ۲۰۰۰ کو بی بی سی لندن کے ایک نشریہ میں انبالہ کا ذکر سنا۔ یہ انبالہ کی جامع مسجد کے خطیب قاری محمد اسحاق صاحب کا انٹرویو تھا۔ انہوں نے بتایا کہ تقسیم سے پہلے انبالہ شہر میں ۲۰۰ مسجدیں تھیں۔ تقسیم کے بعد انبالہ سے امرتسر کا علاقہ مسلمانوں سے خالی ہوگیا تھا۔ اب اس علاقہ میں ہر جگہ مسلمان آکر آباد ہوگئے ہیں۔ ہر جگہ مسجدوں سے اللہ اکبر کی آوازیں دوبارہ سنائی دینے لگی ہیں۔ انبالہ میں اس وقت پانچ مسجدیں آباد ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ انبالہ کی جامع مسجد میں تقسیم کے بعد کچھ غیر مسلم رہنے لگے تھے۔ ۱۹۵۱ میں مجھے وقف بورڈ کی طرف سے یہاں کا امام مقرر کیا گیا تو میں نے ان قابضین کے خلاف کارروائی شروع کی۔ کئی سال کے مقدمہ کے بعد مقامی ہندوؤں کی مدد سے مسجد خالی کرانے میں کامیابی ہوئی۔

قاری محمد اسحاق صاحب نے اپنے انٹرویو میں بتایا کہ جب انبالہ کی جامع مسجد خالی ہوگئی اور یہاں صفائی کرکے پہلا جمعہ پڑھا گیا تو وہ ایک عجیب یادگار دن تھا۔ میں منبر پر خطبہ پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو میں جذبات سے اس قدر بھرا ہوا تھا کہ میں بے اختیار رونے لگا۔ میں نے اس دن پورا خطبہ روتے ہوئے پڑھا۔ جمعہ کی اس نماز میں کافی مسلمان اکٹھا ہوگئے تھے۔ ان میں کئی ایسے مسلمان بھی تھے جو فوجی ملازمتوں میں تھے۔ لوگوں پر ایسا تأثر ہوا کہ سب کے سب رونے لگے۔

قاری محمد اسحاق صاحب نے بتایا کہ جب میں پہلی بار انبالہ آیا اور جامع مسجد کا منظر دیکھا تو بظاہر یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ یہ مسجد دوبارہ خالی ہوکر آباد کی جاسکے گی۔ مگر اللہ کے بھروسہ پر میں نے اپنا کام شروع کیا۔ اس میں تقریباً تین سال لگے۔ آخرکار مقامی ہندوؤں کا تعاون اور عدالت کے انصاف کی بنا پر مجھے کامیابی ہوئی اور آج اللہ کے فضل سے یہ مسجد پہلے سے زیادہ شاندار طور پر آباد ہے۔

تقریباً چھ گھنٹہ سفر کرنے کے بعد میں امرتسر ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ یہاں گرونانک یونیورسٹی کے ڈاکٹر جسوندر سنگھ ڈھلوں رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہوکر گرونانک یونیورسٹی پہنچا۔ یہاں میرا قیام یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں تھا۔شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے ایک انوکھا احساس میرے ذہن میں آرہا تھا۔آج میں اس تاریخی شہر کو دیکھ رہا ہوں جس کی بنیاد تقریباً پانچ سوسال پہلے قائم کی گئی تھی۔شہر میں صفائی اور ڈسپلن کا معیار ملک کے دوسرے کئی شہروں سے اچھا نظر آیا۔

امرتسر کی ابتدائی بنیاد کے بارے میں ایک عجیب وغریب کہانی مشہور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک عورت کا شوہر اپنگ (اپاہج) ہوگیا تھا۔ جب وہ عورت کہیں جاتی تو اس کو اسے اپنے سر پر رکھ کر لے جانا پڑتا۔ ایک دن وہ اپنے اپنگ شوہر کو لے کر جنگل گئی۔ وہاں اس نے اس کو ایک درخت کے نیچے بٹھایا اور پھر جنگل میں اپنی ضرورت کے لئے چلی گئی۔ درخت کے پاس ایک چشمہ تھا۔ اپنگ مرد نے دیکھا کہ وہاں ایک کوا آیا۔ اس نے اس چشمہ میں غوطہ لگایا۔ غوطہ لگاتے ہی وہ سفید ہوگیا۔اسی طرح وہاں کئی کوے آئے اور ہر ایک چشمہ کے پانی کی طلسماتی کرامت سے کالے سے سفید بنتا رہا۔

یہ دیکھ کر اپنگ مرد کو بھی شوق پیدا ہوا۔ وہ کسی نہ کسی طرح گھسٹ کر چشمہ کے پاس پہنچا اور اس کا پانی اپنے سارے بدن پر ڈالنا شروع کیا۔تھوڑی ہی دیر میں اسے محسوس ہوا کہ میرے اندر تبدیلی آرہی ہے۔ یہاں تک کہ چند لمحوں میں اس کی بیماری ختم ہوگئی اور وہ ایک نارمل انسان بن کر کھڑا ہوگیا۔ یہ تبدیلی اتنی زیادہ نمایاں تھی کہ جب اس کی بیوی آئی تو وہ اس کو پہچان نہ سکی کہ یہ شخص وہی ہے جو میرا شوہر تھا۔اس حیرت انگیز واقعہ کی شہرت بڑھی تو سکھوں کے چوتھے گرو، گرو رام داس جی نے ۱۵۷۷ء میں اسی مقام پر امرتسر شہر کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت یہ پورا علاقہ جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

یہ کہانی بلاشبہہ ایک افسانہ ہے نہ کہ حقیقت۔مگر یہاں کے لوگ اس کہانی کو اس طرح بیان

کرتے ہیں جیسے کہ وہ فی الواقع ایک تاریخی حقیقت ہو۔ مجھے اپنے تجربہ میں بہت کم ایسے لوگ ملے ہیں جو توہم(superstition) اور حقیقت(reality) میں فرق کرتے ہوں۔ ۹۹ فیصد سے زیادہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ جو کچھ وہ سنتے اور پڑھتے ہیں اس کو وہ علمی جانچ(scientific scrutiny) کے بغیر مان لیتے ہیں۔

۵۰۰ سال پہلے امرتسر کے آس پاس بہت دور تک کا علاقہ سرسبز جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ آج یہاں جنگل نظر نہیں آتے۔ جغرافی اصول کے مطابق، کسی ملک کا کم از کم ۳۰ فیصد حصہ جنگل پر مشتمل ہونا چاہئے۔ یہ موسمی توازن کے لئے بے حد ضروری ہے۔ مگر عرصہ سے ہندستان کے جنگلات میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ ۱۹۴۷ میں ہندستان جب آزاد ہوا تو ملک کی زمین کا ۲۲ فیصد حصہ جنگلات کے تحت تھا۔ مسلسل کٹاؤ کے نتیجہ میں آج ہندستان میں صرف ۹ فیصد جنگل باقی رہ گئے ہیں۔ درخت کاٹے جارہے ہیں، مگر درخت لگائے نہیں جاتے۔ یہ بے حد خطرناک صورت حال ہے۔ اس کا برا انجام آج ہی شروع ہو چکا ہے، آئندہ کیا ہوگا اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔

امرتسر کا لفظ سب سے پہلے میں نے غالباً ۱۹۳۵ میں جانا۔ اس وقت میں یوپی کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ مقامی مدرسہ میں جب میں نے ابتدائی اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عربی کی تعلیم شروع کی تو مجھے کتاب النحو اور کتاب الصرف پڑھنے کے لئے دی گئی۔ اس کے مصنف مولانا حافظ عبد الرحمٰن امرتسری تھے۔ یہ دونوں کتابیں میں نے تقریباً رٹ ڈالیں مگر ان کے قدیم اسلوب کی بنا پر ان کو رٹنے کے باوجود میں عربی زبان سے اس قدر نا آشنا رہا کہ میں سوچتا تھا کہ شاید یہ عوامی مقولہ صحیح ہے کہ: پڑھے عربی، پگھلے چربی۔

مگر یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ۱۹۳۸ میں میرے چچا صوفی عبد المجید خاں مرحوم نے مجھے ایک بڑے تعلیمی ادارہ مدرسۃ الاصلاح میں داخل کر دیا۔ یہاں مجھے معلوم ہوا کہ مولانا امرتسری کے قدیم نہج کے علاوہ بھی عربی صرف ونحو کی تعلیم کا ایک اور طریقہ ہے جو اس کے مقابلہ میں نہایت آسان اور قابل فہم ہے۔ یہ مولانا حمید الدین فراہی کی تیار کردہ کتابیں، اسباق النحو اور اسباق الصرف، وغیرہ تھیں جو

قدیم انداز سے ہٹ کر نئے انداز میں لکھی گئی تھیں۔ یہ گویا عربی گرامر کی کامیاب تسہیل تھی۔

جب میں نے مولانا حمید الدین فراہی کی کتابوں کے ذریعہ عربی نحو اور صرف کو پڑھنا شروع کیا تو وہ میرے لئے اتنا زیادہ آسان ثابت ہوا کہ وہ میرا محبوب موضوع بن گیا۔ تسہیل کے انداز میں اب بہت سی کتابیں اردو، عربی اور انگریزی میں دستیاب ہیں۔

اس ابتدائی دور تعلیم کی ایک مثال اب تک مجھے یاد ہے۔ یہ عربی انشاء کا ایک پرچہ تھا۔ اس پرچہ میں اردو کے کچھ جملے تھے جن کو عربی میں منتقل کرنا تھا۔ ان میں سے ایک جملہ یہ تھا کہ میں تین دن سے بخار میں مبتلا ہوں۔ میرے درجہ کے تقریباً تمام طلبہ نے اس جملہ کی عربی اس طرح بنائی تھی: **إني مبتلأبالحمیٰ منذ ثلاثة ایام**۔ مگر میں نے اس کی عربی کسی قدر فرق کے ساتھ اس طرح بنائی تھی: **اُبتُلیت بالحمیٰ منذ ثلاثة أیام**۔

یہ پرچہ مدرسہ کے جس استاد کے پاس تھا انہوں نے بعد کو مجھے بلایا اور کہا کہ دوسرے طالب علموں کے ترجمہ میں اردو پن تھا اور تمہارے ترجمہ میں عربی پن۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے اندر ادبی ذوق ہے اس لئے تم لکھنے کی مشق کرو اور مجھے دکھایا کرو۔

امرتسر میں یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں جب میں اپنے کمرہ میں آیا تو یہاں کے کارکن نے کہا کہ آپ کو یہاں اپنے سامان کے بارہ میں کچھ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں آپ کی ہر چیز تالہ کے بغیر سرکچھت ہے۔ میرے پاس اگر چہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کی حفاظت کی ضرورت ہو لیکن جب میں وہاں گھوما پھرا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے گیسٹ ہاؤس کا پورا ماحول زبان حال سے کہہ رہا ہو کہ فکر نہ کیجئے، یہاں آپ کی ہر چیز بالکل محفوظ ہے۔

گیسٹ ہاؤس کے پاس بہت بڑا پارک تھا۔ میں شام کو اس پارک میں دیر تک ٹہلتا رہا۔ اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا مگر میں نے دیکھا کہ پارک کے مختلف حصوں میں عورتیں بے فکری کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں جیسے کہ انہیں کسی چیز کا ڈر نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح سکھ لوگوں کے درمیان یہ روایت قائم ہو چکی ہے کہ کوئی سردار کبھی بھیک نہیں مانگتا اسی طرح شاید یہاں کی روایت میں یہ بھی شامل ہو چکا

ہے کہ چوری وغیرہ جیسی چیز کو سردار لوگ اپنے لئے اپنے رتبہ سے کم تر چیز سمجھتے ہیں۔

امرتسر کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موسمی راجدھانی تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اگرچہ تعلیم یافتہ نہ تھا مگر وہ غیر معمولی صفات کا حامل تھا، اس کے بارے میں بہت سے واقعات معلوم ہوئے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے ہاتھی پر بیٹھ کر بازار میں نکلا۔ اس وقت ایک پیشہ ور رقاصہ بھی اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ منظر سردار لوگوں کو بہت ناپسند ہوا۔ چنانچہ اس کا مقدمہ اکال تخت تک پہنچا۔ اکال تخت کی طرف سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو بلایا گیا۔ اس کا جرم ثابت ہونے پر اکال تخت کی طرف سے یہ فیصلہ سنایا گیا کہ رنجیت سنگھ کے شاہانہ کپڑے اتار دئے جائیں اور اس کو ایک پیڑ میں باندھ دیا جائے اور اس کے بعد اس کو جوتے سے مارا جائے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس اس وقت ایک طاقتور فوج تھی۔ وہ اس فیصلہ کو نہ ماننے کے لئے کوئی بھی کارروائی کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے خاموشی کے ساتھ اس فیصلہ کو مان لیا۔ یہاں تک کہ ان کو پیڑ سے باندھ دیا گیا۔ قریب تھا کہ ان کو جوتے سے مارا جائے۔ مگر حاضرین نے ایک زبان ہو کر کہا کہ بس، اتنا کافی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ان کو چھوڑ دیا گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایسا کر کے اپنی قوم پر بہت بڑا احسان کیا۔ کیوں کہ اس طرح انہوں نے اعتراف کی عظیم روایت اپنی قوم میں قائم کر دی۔ قومی زندگی روایات پر چلتی ہے۔ اور اس قسم کی اعلیٰ روایات ہمیشہ قوم کے بڑے لوگ قائم کرتے ہیں۔ کسی بڑے آدمی کے لئے مذکورہ قسم کی روایت قائم کرنا بلاشبہہ نہایت مشکل قربانی ہے۔ مگر وہی قوم ترقی کرتی ہے جس کے بڑے اس قسم کی مشکل قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔

امرتسر ایک تاریخی شہر ہے۔ ہندستان میں ۳۰۰۰ تاریخی شہر اور قصبے ہیں۔ امرتسر ان میں سے ایک اہم شہر ہے۔ وہ ملک کے شمال مغربی حصہ میں واقع ہے۔ وہ راجدھانی دہلی سے ۴۶۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ پاکستان کی بین اقوامی سرحد سے وہ صرف ۲۶ کیلومیٹر دور ہے۔

امرتسر پنجاب کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس شہر کو گرورام داس نے ۱۵۷۷ میں قائم کیا۔

گرورام داس سکھوں کے چوتھے گرو تھے۔ انہوں نے امرتسر کو ایک مقدس تالاب کے کنارے قائم کیا جس کا نام امریتا سرس تھا۔ شہر کا نام اس تالاب کے نام پر امرتسر رکھا گیا۔ امرتسر سکھ دھرم کا مرکزی مقام ہے۔ ۱۸۴۹ میں اس کو برٹش انڈیا میں شامل کیا گیا۔ مشہور جلیان والا باغ اسی امرتسر میں ہے جہاں انگریزی فوج نے ۱۹۱۹ میں ایک سیاسی جلسہ پر گولی چلا دی تھی جس میں سیکڑوں آدمی مر گئے تھے۔

امرتسر کے جلیان والا باغ کو باہر سے دیکھا۔ ۱۹۱۹ میں جب کہ یہاں جنرل ڈائر نے گولی چلائی تھی اس وقت وہ ایک پارک کی صورت میں تھا۔ اس فائرنگ میں ۳۷۹ لوگ مرے تھے اور ۱۲۰۰ لوگ زخمی ہوئے تھے۔

اس واقعہ کے بارے میں لمبی مدت تک میں صرف یہی جانتا تھا کہ انگریز نے یہاں نہتے لوگوں پر گولی چلائی۔ بہت بعد کو ذاتی مطالعہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ ایک خلاف قانون جلسہ تھا جو پیشگی ممانعت کے باوجود کیا گیا تھا۔

آزادیٔ ہند کی تحریک پر امن اصول کی بنیاد پر چلائی گئی۔ یہ بات صرف جزئی طور پر درست ہے کیوں کہ عملاً جو ہوا وہ یہ تھا کہ اس پر امن لڑائی میں گولی اور بم کی جگہ ''قانون شکنی'' کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ قانون شکنی کو ہمارے تمام لیڈروں نے بہت بڑے پیمانہ پر گلوریفائی (glorify) کیا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے کی قانون شکنی بظاہر انگریزی حکومت کے خلاف تھی، اس لئے اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی۔ مگر ملک کا پورا معاشرہ قانون شکنی کے اس مزاج کو لے کر جب آزادی کے دور میں داخل ہوا تو اب قانون شکنی کے اس ''بم'' کا نشانہ خارجی دشمن نہیں بلکہ خود اپنا ملک اور اپنا سماج تھا۔ پچھلے آندولن کے نتیجے میں قانون کے احترام کی روایات ٹوٹ چکی تھیں۔ اس کے برعکس قانون کو ناقابل احترام سمجھنے کی روایات ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک لاقانونیت (lawlessness) کا شکار ہو کر رہ گیا۔

امرتسر کا گردوارہ مختلف ناموں سے مشہور ہے: ہری مندر، دربار صاحب، سورن مندر،

گولڈن ٹیمپل۔ یہ سِکھ لوگوں کا سب سے زیادہ مقدس مقام ہے۔ یہ گردوارہ ۱۶۰۴ میں گروارجن نے بنایا تھا۔ اس کا سنگ بنیاد لاہور کے ایک صوفی میاں میر نے رکھا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت (۱۸۰۱۔۱۸۳۹) میں اس پر سونے کی پلیٹیں چڑھائی گئیں جو آج تک اس کے اوپر موجود ہیں۔

گولڈن ٹیمپل ایک کیلومیٹر مربع کے رقبہ میں واقع ہے۔ وہ ۲۴ گھنٹہ کھلا رہتا ہے۔ یہاں ہر روز تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کو تینوں وقت لنگر کے تحت کھانا کھلایا جاتا ہے۔ آپ رات دن جس وقت بھی وہاں جائیں، وہ انسانوں سے آباد ملے گا۔

ڈاکٹر جسوندر سنگھ ڈھلوں کے ساتھ ۱۴ ستمبر کی رات کو میں وہاں گیا اور تفصیل سے اس کے ہر حصہ کو دیکھا۔ یہاں وہی سب مناظر دکھائی دئے جو عام طور پر درگاہوں میں ہوتے ہیں۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ یہاں سارا کیمپس آخری حد تک صاف ستھرا اور منظّم تھا۔ جوتا رکھنے کے لئے ایک پورا ڈپارٹمنٹ بنا ہوا تھا۔ کہیں کوئی شخص روک ٹوک کرنے والا یا نذرانہ مانگنے والا دکھائی نہیں دیا۔ اس کے گیٹ پر فقیروں کی قطاریں بھی نہیں تھیں۔ یہ گردوارہ ایک وسیع ایمپائر کی مانند تھا۔ وہاں صفائی اور انتظام اور لنگر سے لے کر زائرین کے جوتوں کی نگہداشت تک ہر قسم کی سرگرمیاں نہایت نظم اور سلیقہ کے ساتھ جاری تھیں۔ اور یہ سب کچھ والنٹیر قسم کے لوگ انجام دے رہے تھے۔ یہاں نہ کوئی تنخواہ دار عملہ تھا اور نہ مختلف قسم کے کاموں کی دیکھ بھال کے لئے کوئی ناظم یا نگراں۔ ہر کام آٹو میٹک مشین کی طرح انجام پا رہا تھا۔ میں دیر تک اس گردوارہ میں رہا اور نیچے اوپر اس کے تقریباً ہر حصہ کو چل کر دیکھا۔ میں مسلم دنیا اور غیر مسلم دنیا کے بیشتر مقامات پر گیا ہوں مگر اس قسم کا نظم اور صفائی مجھے کسی اور جگہ دیکھنے کو نہیں ملی۔ اور یہ بات تو ناقابل فہم حد تک تعجب خیز تھی کہ اگرچہ یہاں رات دن لاکھوں کی تعداد میں زائرین آتے ہیں مگر ان زائرین کا مالی استحصال کرنے والا یہاں کوئی نہیں۔

ان سب سے بڑھ کر اعجب العجائب چیز جو وہاں میرے تجربہ میں آئی وہ یہ تھی کہ ان ساری اعلیٰ

ترین سرگرمیوں کا مرکز جو چیز تھی وہ سائنٹفک ذہن رکھنے والے ایک انسان کے لئے توہم (superstition) کے سوا اور کچھ نہیں۔ اتفاق سے میں ایسے وقت وہاں گیا تھا جب کہ میں اس توہماتی معاملہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا۔

گردوارہ کے درمیانی حصہ میں ایک مخصوص جگہ ہے جہاں وہ مقدس کتاب رکھی ہوئی ہے جس کو گروگرنتھ صاحب کہا جاتا ہے۔ یہ ایک موٹی، چوکور سائز میں ہاتھ سے لکھی ہوئی کتاب ہے جو سکھ عقیدہ کے مطابق عام معنوں میں صرف ایک کتاب نہیں ہے بلکہ وہ زندہ گرو کی حیثیت رکھتی ہے۔ پوری کتاب ایک خاص کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کو ہر روز سونے کی ایک پالکی میں رکھ کر ایک زندہ آدمی کی طرح اکال تخت لے جایا جاتا ہے۔ اس دوران اس کے رکھنے کی مخصوص جگہ کو اہتمام کے ساتھ دھویا جاتا ہے اور صاف کیا جاتا ہے۔ اور پھر گروگرنتھ صاحب کو دوبارہ سونے کی پالکی میں رکھ کر واپس لاتے ہیں۔ اس پورے عمل کے دوران وہاں معتقدین کی زبردست بھیڑ رہتی ہے۔ گروگرنتھ صاحب کے اوپر مورچھل کے ذریعہ مسلسل پنکھا کیا جاتا ہے جیسے کہ وہ سچ مچ کوئی زندہ شخصیت ہو۔

اس پورے معاملہ کی توجیہ کیا ہے، یہ ایک مشکل سوال ہے۔ تجربہ کی روشنی میں ایک بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ اس دنیا میں پراسرار عقیدہ عوام کے لیے ہمیشہ زیادہ طاقتور ثابت ہوا ہے، خواہ وہ کتنا ہی زیادہ خلاف عقل کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس عقلی اور منطقی بات عملاً سب سے زیادہ غیر مؤثر رہی ہے خواہ وہ کتنا ہی زیادہ ثابت شدہ کیوں نہ ہو۔ اس فرق کا سبب غالباً یہ ہے کہ پراسرار چیز میں ہمیشہ برکت کا تصور شامل ہو جاتا ہے۔ اس میں ہر شخص کو اپنی حالت اور ضرورت کے لحاظ سے برکت ملنے لگتی ہے، اگرچہ یہ پورا معاملہ فرضی امیدوں کا کاروبار (false hopes business) کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو چیز عقلی اور منطقی ہو اس میں لوگوں کو برکت دکھائی نہیں دیتی۔

سکھ دھرم میں گرو گوبند سنگھ کو دسواں گرو مانا جاتا ہے۔ انہوں نے یہ حکم دیا کہ دسویں گرو کے بعد اب کوئی زندہ گرو نہیں ہوگا۔ یہ جو آدی گرنتھ ہے اب سے وہ گروگرنتھ صاحب کہا جائے گا۔ اس کو لونگ

گرو (living guru) کی طرح مانا جائے۔ سب سکھن کو حکم ہے گرو مانیو گرنتھ۔

یہ ایک عجیب وغریب عقیدہ ہے کہ ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک کتاب کو ہمیشہ کے لئے زندہ گرو کے طور پر مانا جاتا رہے۔ بظاہر یہ ایک توہماتی قسم کا عقیدہ ہے۔ مگر اس توہماتی عقیدہ کا عملی فائدہ سکھ کمیونٹی کو یہ ملا کہ وہ سیکڑوں سال سے متحد حالت میں قائم ہے۔ ''زندہ گرو'' کا یہی غیر زندہ عقیدہ ہے جو سکھوں کو زندہ قوم بنانے میں سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوا ہے۔

میرے تجربہ کے مطابق، سردار لوگوں میں ایک استثنائی صفت ہے اور وہ ہے ڈائرکشن کو فوراً بدل لینا۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے ۱۹۶۵ کا ایک واقعہ بتایا۔ اس وقت وہ نینی تال میں تھے۔ وہاں انہوں نے ایک سڑک پر دیکھا کہ ایک اسکوٹر والا پیدل چلتے ہوئے ایک نوجوان سے ٹکرا گیا۔ دونوں میں کسی کو سخت چوٹ تو نہیں آئی، تاہم دونوں سڑک پر گر پڑے۔ دونوں میں سے ایک بظاہر کمزور تھا اور دوسرا طاقتور اور تنومند۔ طاقتور آدمی کمزور نوجوان کو گرا کر اس کے سینہ پر بیٹھ گیا اور اس کو مارنے لگا۔ عین اُس وقت نوجوان نے پنجابی زبان میں کچھ کہا۔ یہ سن کر اوپر والے آدمی نے اس سے پوچھا: کیا تم سردار ہو۔ نیچے والے نوجوان نے کہا کہ ہاں۔ اس کے بعد اوپر والے آدمی نے فوراً اس کو چھوڑ دیا اور کہا کہ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ (سبق آموز واقعات، صفحہ ۲۸)

ایک لمحہ میں ڈائرکشن کو بدل لینے کی یہ صفت سردار لوگوں میں بہت زیادہ ہے۔ اس کا ایک انوکھا مظاہرہ بیسویں صدی کے ربع آخر میں ہوا۔ اس زمانہ میں پنجاب میں علٰیحدہ اسٹیٹ بنانے کی تحریک ہنگامہ خیز طور پر شروع ہوئی۔ ۱۹۸۴ میں یہ تحریک اتنے عروج پر پہنچ گئی کہ بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ علٰیحدہ سکھ اسٹیٹ بن کر رہے گا۔

۳ ستمبر ۱۹۸۴ کا واقعہ ہے، لکھنؤ کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان مجھ سے دہلی میں ملے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے پورے یقین کے ساتھ مجھ سے کہا کہ علیحدہ سکھ ریاست بن کر رہے گی۔

میں نے کہا کہ ہرگز ایسا ہونے والا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ سکھ لوگوں کا عزم اتنا زبردست ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں کر کے رہتے ہیں۔ اور اس کو بھی وہ کر کے دکھا دیں گے۔

انہوں نے اپنے قلم سے میری ڈائری میں یہ الفاظ لکھے:

Within 3 years Punjabis will have an independent Khalistan.------Bet Rs. 1 lakh.

ان کو اس معاملہ میں اتنا زیادہ یقین تھا کہ انہوں نے کہا کہ اگر اب سے ۳ سال کے اندر پنجاب میں علیٰحدہ سکھ ریاست نہ بنی تو میں ایک لاکھ روپے آپ کو دوں گا۔ اب اس واقعہ پر ۱۶ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں مگر جیسا کہ معلوم ہے، سکھ ریاست بننا تو درکنار، اس کا تصور بھی اب سکھوں میں ختم ہو گیا۔

میرا ذہن اس طرح کے معاملہ میں ہمیشہ بالکل صاف رہا ہے۔ میں اول دن سے یہ کہتا رہا ہوں کہ سکھ ریاست کبھی بننے والی نہیں۔ اپریل ۱۹۸۶ کے آخری ہفتہ میں امرتسر میں کچھ سکھوں نے بطور خود آزاد خالصتان کے قیام کا اعلان کر دیا۔ عین اسی زمانہ میں میں نے دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس میں ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان یہ تھا:

Acceptance of Reality.

میرا یہ مضمون پنجاب اور کشمیر دونوں کے بارے میں تھا۔ میں نے پنجابیوں اور کشمیریوں دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ علیٰحدہ پنجاب اور علیٰحدہ کشمیر کی تحریکیں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں، وہ حقیقت کی چٹان سے ٹکرانے کے ہم معنی ہے۔ اس قسم کی کوشش سے کچھ لوگ اپنا سر تو توڑ سکتے ہیں مگر وہ صورت حال کو بدل نہیں سکتے۔ میں نے دونوں جگہ کے لوگوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لیں اور صورت موجودہ (statusquo) کو مان کر مثبت انداز میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔

سکھ لوگ جلد ہی معاملہ کو سمجھ گئے۔ اور انہوں نے اس معاملہ میں اپنی متشددانہ تحریک ختم کر دی۔ کشمیر کے لوگ بھی یقینی طور پر آخر کار یہی راستہ اختیار کریں گے مگر اس وقت جب کہ ان پر فارسی کا یہ شعر صادق آچکا ہوگا:

آں چہ دانا کند کند ناداں لیک بعد از خرابیٔ بسیار

اس فرق کا سبب غالباً یہ ہے کہ سکھ لوگوں کے پاس اپنی تباہی کو جائز ثابت (justify) کرنے کے لئے کوئی شاندار نظریہ موجود نہ تھا۔ جب کہ دوسرے گروہ کے پاس ایسے شاندار نظریات موجود ہیں جن کے ذریعہ وہ خودکشی کو شہادت جیسا خوبصورت عنوان دے سکیں۔

مذکورہ قسم کا ایک تجربہ مجھے کشمیر کے معاملہ میں بھی پیش آیا۔ ۲۷ جنوری ۱۹۹۲ کا واقعہ ہے۔ کشمیر کے دو تعلیم یافتہ مسلمان دہلی آئے اور مجھ سے ملاقات کی۔ یہ لوگ خود تو کسی جنگجو تنظیم کے باضابطہ ممبر نہیں تھے مگر وہ کشمیر کی جنگجوئی کی تحریک کے پوری طرح حامی تھے۔ وہ عملی جنگجو نہ ہوتے ہوئے بھی پورے معنیٰ میں فکری جنگجو تھے۔

گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آپ لوگوں کی نام نہاد تحریکِ کشمیر کسی بھی اعتبار سے درست نہیں۔ وہ نہ جہاد ہے اور نہ اس سے اسلامی نظام قائم ہونے والا ہے۔ اور نہ علیٰحدگی کی کوئی معنویت ہے۔ اس کا نتیجہ بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ انہوں نے پرجوش طور پر اپنی موجودہ تحریک کی حمایت کی اور دعویٰ کیا کہ ہم جلد ہی ایک عظیم کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ پھر انہوں نے میرے کہنے پر اپنے دستخط کے ساتھ حسب ذیل الفاظ میری ڈائری میں لکھے:

ہندستان سے علیٰحدگی کے بعد جو کشمیر بنے گا، انشاء اللہ وہ کشمیر اسلامی کشمیر ہوگا۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ آپ لوگوں کی یہ بات بے بنیاد خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔ آپ لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے اندازے کتنے زیادہ بے حقیقت تھے۔ پھر میں نے اپنی ڈائری میں ان کے سامنے یہ الفاظ لکھے:

بالفرض اگر کشمیر ہندستان سے علیٰحدہ ہو تو اس کے بعد جو آزاد کشمیر یا پاکستانی کشمیر بنے گا وہ ایک برباد کشمیر ہوگا۔ کشمیریوں کے لئے چوائس (choice) ہندستانی کشمیر یا پاکستانی کشمیر میں نہیں ہے۔ بلکہ ہندستانی کشمیر یا برباد کشمیر میں ہے۔

اس واقعہ پر اب تقریباً دس سال پورے ہو رہے ہیں۔ اس دس سالہ تجربہ نے آخری طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ مذکورہ کشمیری مجاہد کے الفاظ فرضی خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہ تھے۔ اس کے برعکس میں

نے جو کچھ اللہ کی توفیق سے کہا وہ آج ایک ناقابل انکار حقیقت بن چکا ہے۔ واقعات نے یہ ثابت کیا ہے کہ کشمیر کا فائدہ نہ آزاد کشمیر بننے میں ہے اور نہ پاکستانی کشمیر بننے میں۔ کشمیر کا فائدہ ہر اعتبار سے یہ ہے کہ وہ ہندستان کا حصہ بن جائے اور ٹکراؤ کی پالیسی کو چھوڑ کر پر امن تعمیر کا طریقہ اختیار کرلے۔

۱۴ ستمبر کی شام کا کھانا گرونانک یونیورسٹی کے پروفیسر جسوندر سنگھ ڈھلوں (Tel. 0183-258312) کے یہاں تھا۔ کھانے کی میز پر دوسری چیزوں کے ساتھ باسمتی چاول بھی تھا جس کو صاحب خانہ نے اہتمام کے ساتھ بنوایا تھا۔ مجھے ذاتی طور پر لذیذ کھانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں ہر چاول کو یکساں طور پر اللہ کی نعمت سمجھ کر کھاتا ہوں۔ لیکن میز پر باسمتی چاول ہونے کی وجہ سے اس سے متعلق ایک اور گفتگو شروع ہوگئی۔ میں نے پوچھا کہ اخباروں میں آیا ہے کہ امریکہ نے باسمتی چاول کو پیٹنٹ کرالیا ہے۔ اس کے مطابق، کوئی دوسرا شخص باسمتی چاول نہیں بیچ سکتا۔ اس بات کو عام طور پر اسی انداز میں لیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے معاملہ صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آتا۔ پروفیسر صاحب نے بتایا کہ امریکہ نے جس چیز کو پیٹنٹ کیا ہے وہ خود باسمتی چاول نہیں ہے۔ بلکہ باسمتی چاول کی وہ قسم ہے جس کو وہ خرید کر اپنے انداز میں پراسس کرکے اپنے علٰحیدہ ٹریڈ مارک کے ساتھ بازار میں لائے گا۔ مثلاً امریکہ اگر جدید ٹکنیک کے ذریعہ باسمتی چاول کی ایک قسم تیار کرتا ہے اور اس کو اپنے انداز میں پیک کرتا ہے اور پھر اس کو گولڈن باسمتی کے نام سے بازار میں لاتا ہے تو اس مخصوص نام کے ساتھ کسی اور کو باسمتی چاول بیچنے کی اجازت نہ ہوگی۔

یہی معاملہ ان دوسری چیزوں کا ہے جن کو امریکہ نے پیٹنٹ کیا ہے یا کرا رہا ہے۔ مثلاً نیم، کریلا، ہلدی، وغیرہ۔ ہر چیز کا معاملہ یہی ہے کہ امریکہ نے خود جنس کو پیٹنٹ نہیں کیا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ بلکہ اپنے ٹریڈ مارک کو پیٹنٹ کیا ہے جس کے تحت وہ کسی جنس کو مارکیٹ کرنا چاہتا ہے۔

اس معاملہ میں اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہندستانی تاجروں کو یہ ڈر ہوا کہ جس طرح 'کوکا کولا' نے آکر دوسرے تمام ہندستانی ڈرنک کو بازار سے باہر کردیا ہے۔ کیوں کہ خریدنے والے کوکا کولا کی موجودگی میں دوسری چیزوں کی خریداری پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح امریکہ کی ''گولڈن کوالٹی'' کا باسمتی چاول یا

اور کوئی چیز بازار میں آئے گی تو وہ اپنی کوالٹی نیز اپنی پبلسٹی کے اعتبار سے اتنی ممتاز ہوگی کہ لوگ اسی پر ٹوٹ پڑیں گے اور ہندستانی تاجروں کے غیر معیاری سامان کو خریدنا پسند نہ کریں گے، اگر چہ یہ ہندستانی سامان بھی افراط کے ساتھ بازار میں موجود ہوگا۔ ہندستانی تاجروں کو کہنا یہ چاہئے تھا کہ امریکہ کے معیاری سامان کی موجودگی میں خود ہندستانی لوگ ہمارا غیر معیاری سامان نہیں خریدیں گے۔ مگر ایسا نہ کہہ کر انہوں نے جذباتی الفاظ بول کر امریکہ کو بدنام کرنا شروع کیا۔ تا کہ ان کی نا اہلی چھپی رہے، وہ عوام پر ظاہر نہ ہونے پائے۔

ایک پروفیسر نے تعلیم کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم صرف کالج یا یونیورسٹی سے ڈگری لینے کا نام نہیں، تعلیم ایک ایسا مسلسل عمل ہے جو آدمی کی آخر عمر تک جاری رہتا ہے:

Education is a life-long process.

یہ بات نہایت درست ہے۔ کسی تعلیم گاہ کی ڈگری صرف جاب کے لئے ہوتی ہے نہ کہ علم کے لئے۔ علم ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ جس آدمی کے اندر علم کا ذوق پیدا ہو جائے وہ کسی مقام پر ٹھہر نہیں سکتا۔ عربی کا یہ مقولہ بالکل درست ہے کہ علم تم کو اپنا جزء اس وقت تک نہیں دیتا جب تک کہ تم اپنا کل اس کو نہ دے دو (**العلم لا یعطیک جزء ہ حتی تعطیه کلک**)۔

۱۵ ستمبر کی صبح کو گیسٹ ہاؤس میں اول وقت میں نے فجر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد باہر نکل کر گیسٹ ہاؤس کے وسیع گارڈن میں ٹہلنے لگا۔ اس وقت گارڈن میں تقریباً سناٹا تھا۔ تاہم ہر طرف ہرے بھرے درخت کھڑے ہوئے نظر آرہے تھے۔ یہ درخت ہر طرف اپنی خاموش زبان میں قدرت کے پیغامات نشر کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ ہرے بھرے درخت اپنی آس پاس کی دنیا سے کیا کہہ رہے ہیں۔ شاید وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر تم اپنی تعمیر چاہتے ہو تو ہماری طرح خاموش عمل کرو۔ شور اور ہنگامہ کے ذریعہ تخریب تو کی جاسکتی ہے مگر حقیقی تعمیر شور اور ہنگامہ کے ذریعہ ممکن نہیں۔

۱۵ ستمبر کو آج کا انگریزی روزنامہ ٹری بیون (چندی گڈھ) دیکھا۔ اس کے صفحۂ اول پر ایک نمایاں خبر یہ تھی کہ امریکہ کے ''صنعتی شہنشاہ'' ولیم بل گیٹس (William Bill Gates) چند دن

کے دورے پر ہندستان آئے ہیں۔ ان کا یہ سفر کس لئے ہوا اس پر غور کیجئے تو ایک اہم حقیقت سامنے آئے گی۔

آزادی (۱۹۴۷) کے بعد ملک کے حکمرانوں نے یہاں، اپنے الفاظ میں مخلوط اقتصادیات (mixed economy) کا نظام قائم کیا۔ یعنی پرائیویٹ سیکٹر، اور پبلک سیکٹر کے نام سے سرکاری سیکٹر۔ نام نہاد پبلک سیکٹر نے ملک کو تباہ کرنے کے سوا کوئی اور کارنامہ انجام نہیں دیا۔ البتہ پرائیویٹ سیکٹر نے مصنوعی پابندیوں کے باوجود، بہت بڑا کام کیا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پبلک سیکٹر کا کوئی ایسا کارنامہ نہیں جس کو دیکھنے کے لئے ترقی یافتہ ملک کے لوگ ہندستان آئیں۔ جب کہ پرائیویٹ سیکٹر نے ایسے کئی نمایاں کام کئے ہیں جن کو دیکھنے اور ان سے معاملہ کرنے کے لئے ترقی یافتہ ملکوں کے لوگ روزانہ یہاں آرہے ہیں۔ انہی میں سے ایک کمپیوٹر یا انفارمیشن ٹکنالوجی ہے۔ جس نے پچھلے برسوں میں نمایاں ترقی حاصل کی ہے۔ یہ ترقی صدفی صد پرائیویٹ سیکٹر کے تحت انجام پائی ہے۔ اسی کو دیکھنے کے لئے امریکہ کے مذکورہ صنعت کار ہندستان آئے۔

۱۵ ستمبر کو ساڑھے دس بجے یونیورسٹی کے ہال میں تقریر کا انتظام تھا۔ یہاں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے اساتذہ تھے۔ ان میں کچھ سینئر افراد بھی موجود تھے۔ مثلاً بابا نریندر سنگھ (عمر ۹۲ سال) ان سے میں نے پوچھا کہ آپ اپنا کوئی تجربہ بتائیے۔ انہوں نے کہا کہ سب سے بڑا تجربہ تو یہی ہے کہ آج آپ سے ملاقات ہوگئی۔

میرے خطاب سے پہلے یونیورسٹی کے بعض ذمہ داروں نے تقریریں کیں۔ انہوں نے کہا کہ آج ہمارے درمیان اسلام کے ایک بڑے عالم موجود ہیں۔ ہم ان سے جاننا چاہیں گے کہ اسلام کی تعلیمات کیا ہیں اور انسانیت کے لئے اس کا نظریہ کیا ہے۔ اس کے بعد مجھے موقع دیا گیا۔ میں نے اپنی ۴۵ منٹ کی تقریر میں تفصیل کے ساتھ اسلام کے انسانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے اس کو واضح کیا۔

تقریر کے بعد سوال وجواب کا وقفہ تھا۔ لوگوں نے کثرت سے سوالات کئے۔ مردوں نے بھی

اور خواتین نے بھی۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ کے یہاں یہ قانون ہے کہ کوئی غیر مسلم کعبہ میں نہیں جا سکتا۔ اب اگر کوئی شخص اسلام کو سمجھنا چاہتا ہے تو وہ کیسے اسلام کو سمجھے گا۔

میں نے کہا کہ اسلام کو سمجھنے کے لئے مکہ جا کر کعبہ کو دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہزاروں مسلمان جو حج کی استطاعت نہیں رکھتے وہ کعبہ کو دیکھے بغیر مر جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کو مسلمان ہی مانا جاتا ہے۔ کعبہ نہ دیکھنے کی وجہ سے ان کے اسلام میں کوئی کمی نہیں آتی۔ میں نے کہا کہ اسلام کیا ہے اس کو جاننے کے لئے آپ کو قرآن وحدیث وسیرت رسول کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہی چیزیں اسلام کا اصل ماخذ ہیں۔ کعبہ کی زیارت کا تعلق اسلام کو سمجھنے سے نہیں ہے بلکہ اسلام کو مان لینے کے بعد اس کے احکام کی تعمیل سے ہے۔

پھر میں نے کہا کہ کعبہ یا بیت اللہ کے سلسلہ میں ''پابندی'' صرف غیر مسلموں کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے بھی ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ حرم کعبہ میں داخل ہو کر وہاں کسی کو ستائیں یا خون بہائیں۔ حتی کہ کسی جانور کا بھی نہیں۔ اس دوطرفہ حرمت کا سبب کعبہ کو پاک رکھنا ہے۔ مسلمانوں پر یہ پابندی اس لئے ہے تاکہ وہ بیت اللہ کو اپنی سیاست کا اڈہ نہ بنائیں۔ اور غیر مسلموں پر جو پابندی ہے وہ اس لئے ہے تاکہ وہ اس کو بتوں کا اڈہ نہ بنائیں جیسا کہ ظہور اسلام سے پہلے کیا گیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام سے پہلے وہاں یہ پابندی نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بت پرست لوگوں نے اپنے اپنے بت لا کر کعبہ میں رکھنا شروع کر دئے یہاں تک کہ وہ ۳۶۰ بتوں کا مرکز بن گیا۔ موجودہ پابندی اس لئے ہے کہ یہ تاریخ دوبارہ کعبہ میں دہرائی نہ جا سکے۔

یونیورسٹی کا یہ ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ اس میں یونیورسٹی کے علاوہ دوسرے کالجوں کے اساتذہ بھی شریک تھے۔ اسلام کے بارے میں کثرت سے سوالات کئے گئے۔ میں نے ہر سوال کا جواب معتدل انداز میں دیا۔ لوگ خدا کے فضل سے مطمئن ہو گئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ کچھ مسلم ملکوں میں قرآن کا قانون نافذ کیا جا رہا ہے جس کی خبریں میڈیا میں آ رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ اس وقت کوئی بھی مسلم ملک ایسا نہیں ہے جہاں واقعی معنوں میں قرآن کے قانون کو نافذ کیا گیا ہو۔ جو کچھ آپ سنتے

ہیں وہ قرآن کے نام پر اپنی پالیٹکس چلانا ہے۔ وہ اسلام کو exploit کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اسلام کے ہنگامے تو بہت سنتے ہیں مگر اسلام کی رحمتیں اور برکتیں کسی مسلم ملک میں دکھائی نہیں دیتیں۔

امرتسر کی گرونانک یونیورسٹی میں انگریزی اخبار انڈین ایکسپریس کے مقامی نمائندہ رچنا سوبیرسین (Tel.:553618) نے ملاقات کی۔ انہوں نے اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات کا تعلق کچھ مسلمانوں سے تھا اور کچھ ملک سے۔ ایک سوال کے جواب میں، میں نے کہا کہ مسلم کمیونٹی کی تصویر جو آپ کے ذہن میں ہے وہ حقیقی تصویر نہیں ہے، بلکہ اخباری تصویر ہے۔ آپ جیسے لوگ اخباروں میں جو کچھ پڑھتے ہیں اسی سے مسلم کمیونٹی کے بارے میں رائے بناتے ہیں۔ جب کہ اخبارات یا میڈیا کا حال یہ ہے کہ وہ سلکٹیو رپورٹنگ کا ادارہ ہے۔ مزید یہ کہ اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر میڈیا زیادہ تر منفی خبروں کو رپورٹ کرتا ہے۔ اور مثبت خبروں کو چھوڑ دیتا ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لئے آپ لوگوں کو اخباری دائرہ سے باہر آنا چاہئے۔ اس کے بغیر آپ لوگ نہ مسلمانوں کے بارے میں درست رائے قائم کر سکتے ہیں اور نہ غیر مسلموں کے بارے میں۔

امرتسر میں بار بار شہر کے اندر جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ یہاں کی سڑکیں دوسرے شہروں کے مقابلہ میں نسبتاً بہتر ہیں، چوڑی اور صاف ستھری بھی۔ فٹ پاتھ پر وہ مناظر بھی نہیں تھے جو عام طور پر ہندستانی شہروں میں ہوتے ہیں۔

یہاں کے ایک صاحب سے میں نے پوچھا کہ پنجاب کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ یہاں کے لوگ زیادہ تر ایگریکلچر میں مصروف رہتے ہیں۔ انڈسٹری میں وہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات صحیح ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں کی زمین اچھی ہے اور زراعت میں انہیں بہت آسانی سے معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں انڈسٹری کا شعبہ انہیں زیادہ محنت طلب معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ زیادہ تر زراعت ہی میں مشغول رہنا پسند کرتے ہیں۔

پنجاب میں زرخیز زمین کی وجہ سے یہاں کے لوگ زیادہ تر زراعت میں رہ گئے۔ راجستھان میں زرخیز زمین نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے لوگوں نے صنعت اور تجارت میں محنت کر کے اعلیٰ

ترقی کی۔اس دنیا میں ناموافق حالات بھی اپنے اندر عظیم موافق پہلو رکھتے ہیں۔

۱۵ ستمبر کی شام کو چندی گڑھ کے اخبار ٹری بیون کے نمائندہ مسٹر اشوک سیٹھی مقیم امرتسر (Tel.: 223680) نے انٹرویولیا۔سوالات کے دوران میں نے کہا کہ فرق اور اختلاف فطرت کا حصہ ہے۔آپ ان کو ختم نہیں کر سکتے۔اس لئے فرق و اختلاف کے ساتھ زندہ رہنے کا آرٹ سیکھنا چاہئے نہ کہ فرق و اختلاف کو ختم کر کے یکساں سماج بنانے کی کوشش کی جائے، کیوں کہ وہ ممکن ہی نہیں۔

۱۵ ستمبر کی شام کو امرتسر سے جالندھر کے لئے روانگی ہوئی۔یہ سفر شان پنجاب ایکسپریس کے ذریعہ طے ہوا۔یہ تقریباً ایک گھنٹہ کا سفر تھا۔''شان پنجاب ایکسپریس'' نام کے اعتبار سے بظاہر جتنی شاندار معلوم ہوتی ہے حقیقت کے اعتبار سے وہ اتنی شاندار نہیں۔اس کی بوگیاں پرانی نظر آئیں۔ہندستان میں چند ٹرینیں تو واقعی اعلیٰ معیار کی نظر آتی ہیں۔مگر بیشتر ٹرینیں خستہ حالت میں ہیں۔یہی حال پٹریوں کا بھی ہے۔اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آئے دن اخباروں میں ٹرین حادثات کی خبریں آتی رہتی ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ ہندستان میں بھی اس قسم کے مسائل کا حل وہی ہے جو مغربی ملکوں میں ہوا ہے۔یعنی اس قسم کے تمام اداروں کو پرائیویٹ ملکیت میں دے دینا۔نام نہاد پبلک سیکٹر یا سرکاری سیکٹر ہی ان تمام مسائل کا اصل سبب ہے۔جواہر لال نہرو اور ان کے ساتھی کرشنا مینن یہ کہا کرتے تھے کہ پبلک سیکٹر کو ہم نے اس لئے قائم کیا ہے کہ سرکاری کنٹرول کے ذریعہ ہم ان کو اعلیٰ کارکردگی کا نمونہ بنائیں تاکہ اس کو دیکھ کر پرائیویٹ سیکٹر بھی اچھی طرح کام کرے۔یہ الفاظ گرامر کے لحاظ سے درست تھے۔مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط۔کیونکہ حسن کارکردگی کا موثر ذریعہ آزادانہ کامپٹیشن ہے، نہ کہ سرکاری کنٹرول۔پبلک سیکٹر میں ذاتی انٹرسٹ کا دباؤ موجود نہیں ہوتا اس لئے پبلک سیکٹر میں بہتر کام بھی نہیں ہوتا۔اس کے برعکس پرائیویٹ سیکٹر میں یہ دباؤ مسلسل طور پر موجود رہتا ہے۔اس لئے یہاں ہر آدمی خود اپنے انٹرسٹ کے تحت مجبور ہوتا ہے کہ وہ بہتر کارکردگی کا نمونہ پیش کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ پبلک سیکٹر کی اس مفروضہ منطق نے ملک کو اتنا پیچھے کر دیا کہ اب وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل ہی نہ رہا۔ یہاں تک کہ نوآبادیاتی نظام (colonialism) دوبارہ ملک کے اندر داخل ہو گیا۔ پہلے وہ براہ راست طور پر سیاسی طاقت کے ذریعہ آیا تھا۔ اب وہ بالواسطہ انداز میں اقتصادی طاقت کے ذریعہ ملک میں آرہا ہے۔

۱۵ ستمبر کو مسٹر ونے کمار کے ساتھ روانہ ہو کر امرتسر ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ یہاں شان پنجاب اکسپریس آچکی تھی اور پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی تھی۔ تاہم سیٹ تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور جلد ہی ہم لوگ گاڑی کے اندر اپنی سیٹ پر پہنچ چکے تھے۔ اس ٹرین سے چل کر مجھے جالندھر پہنچنا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ اسٹیشن سے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹھہرے رہیں۔ اسپک میکے کے لوگ وہیں پلیٹ فارم پر آکر آپ کو لے جائیں گے۔ چنانچہ میں دیر تک پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔ آخر کار جب ٹرین چلی گئی اور پلیٹ فارم مسافروں سے خالی ہو گیا تو میں نے سوچا کہ یہاں سے چل کر گیٹ پر پہنچنا چاہئے۔ گیٹ پر پہنچا تو وہاں اسپک میکے کا بینر لئے ہوئے دو نوجوان میرے انتظار میں موجود تھے۔ یہ دونوں انجینئیر نگ کے طالب علم تھے جن میں سے ایک کا نام ابو شیخ تھا اور دوسرے کا نام مسٹر جارج تھا۔ یہ ''حادثہ'' کیوں پیش آیا۔ اس کا سبب کمیونی کیشن گیپ (communication gap) ہے۔ امرتسر سے ٹیلی فون کرنے والوں نے انہیں بتایا کہ وہ گیٹ پر موجود رہیں، میں گیٹ پر انہیں مل جاؤں گا۔ مگر امرتسر میں جن صاحب نے مجھ کو بتایا انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ جالندھر میں آپ کا استقبال کرنے والے پلیٹ فارم پر موجود رہیں گے، آپ وہیں ٹھہریں۔ پیغام رسانی کے اس فرق نے مسئلہ پیدا کیا۔

اس طرح کے معاملات میں انتہائی محدّد الفاظ میں پیغام رسانی ہونی چاہئے تاکہ طرفین کو غیر مشتبہ طور پر طے شدہ بات کا علم ہو۔ مگر میرا تجربہ ہے کہ معاملات میں محدد اور متعین (specific) انداز میں اطلاع دینا بہت کمیاب ہے۔ بیشتر لوگ غیر محدد انداز میں بات کرنے کے عادی ہیں۔ اس لئے بیشتر حالات میں لوگوں کے درمیان مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

جالندھر ریلوے اسٹیشن سے مسٹر ابو شیخ اور مسٹر جارج کے ساتھ روانہ ہو کر شہر پہنچا۔ یہاں میرا

قیام ڈاکٹر امبیڈکر انجینئرنگ کالج میں تھا۔ یہ کالج اعلیٰ ٹکنکل تعلیم کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس کا کیمپس ۱۵۳۔ ایکڑ کے رقبہ میں واقع ہے۔ یہ ایک خود کفیل کالج ہے۔ یہاں ہر قسم کی ضرورتیں خود کالج کے کیمپس میں پوری ہو جاتی ہیں۔ میرا قیام اس کالج کے گیسٹ ہاؤس میں تھا۔

مسٹر گورپریت سنگھ ڈاکٹر امبیڈکر کالج میں انجینئرنگ کے لکچرر ہیں۔ وہ میرے کمرے میں آئے اور کہا کہ میں نے زی ٹی وی پر آپ کو دیکھا تھا۔ مجھے آپ کی بات اچھی لگی۔ پھر جب معلوم ہوا کہ آپ ہمارے کالج میں آرہے ہیں تو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ آج شام کو یہاں صوفی میوزک کا ایک پروگرام ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کچھ دیر کے لئے اس میں چلیں۔ میں نے معذرت کی مگر پھر ان کے اصرار پر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

یہ پروگرام میرے ذوق کے مطابق نہ تھا۔ مثال کے طور پر یہاں عجیب وغریب طور پر اچھل کود کے انداز میں طلسماتی کہانیاں سنائی جارہی تھیں۔ ایک کہانی یہ تھی کہ دو عورتیں ایک بزرگ کے یہاں آئیں۔ دونوں کا مسئلہ یہ تھا کہ ان کے یہاں بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ بزرگ نے دونوں کو ایک ایک کھجور دی اور کہا کہ اس کو نگل کر کھالینا۔ اس کے بعد ایک عورت کے یہاں بچہ پیدا ہوا اور دوسرے کے یہاں بچہ پیدا نہیں ہوا۔

پھر کچھ عرصہ بعد وہ عورتیں دوبارہ مذکورہ بزرگ کے پاس آئیں۔ بزرگ نے دیکھا کہ ایک عورت کی گود میں بچہ ہے اور دوسری عورت کی گود میں بچہ نہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک عورت نے کھجور کو کھالیا تھا۔ چنانچہ اس کے یہاں بچہ پیدا ہوا۔ دوسری عورت نے کھجور کو طاق پر رکھ دیا اور اس نے نہیں کھایا۔ بزرگ نے دوسری عورت سے کہا کہ تم نے اس کھجور کو کھجور سمجھ کر طاق پر رکھ دیا۔ وہ دراصل بچہ تھا اب دوبارہ جاکر تم اسے دیکھو۔ اس کے بعد عورت اپنے گھر واپس آئی اور کھجور کو توڑ کر دیکھا تو اس کے اندر واقعتاً ایک بچہ موجود تھا۔

یہ بلاشبہہ ایک جھوٹی کہانی ہے۔ مگر اسی قسم کی بے اصل اور بے بنیاد کہانیوں پر بزرگی اور برکت کا وہ کاروبار قائم ہے جو ہندو اور مسلمان دونوں کے یہاں یکساں طور پر موجود ہے۔ ہر مقدس

بزرگ، حتی کہ ہر مقدس جماعت کے گرد بے بنیاد قسم کی کہانیوں کا ایک طلسماتی جال بچھا دیا گیا ہے۔ ان افسانوی داستانوں کو اتنا زیادہ دہرایا جاتا ہے کہ لوگ اس پر یقین کر لیتے ہیں۔

میرے تجربہ کے مطابق، اس دنیا میں سب سے زیادہ جس چیز کی کمی ہے وہ علمی طرز فکر ہے۔ یہ کمی مذکورہ قسم کے لوگوں کے لئے نہایت زرخیز زمین کی حیثیت رکھتی ہے۔ خواب اور مکاشفات اور کرامات کی ''طلسم ہوش ربا'' اسی غیر علمی ذہن پر قائم ہے۔ اسلام اس توہماتی مذہب کو ختم کرنے کے لئے آیا تھا مگر مسلمانوں نے خودساختہ اضافوں کے ذریعہ اپنی محبوب شخصیتوں اور اپنی محبوب جماعتوں کے گرد توہمات کی وہ پوری دنیا آباد کر لی جو نہ صرف غیر حقیقی ہے بلکہ وہ اسلام کی اصل اسپرٹ کو ذبح کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے جالندھر میں کافی مسلمان تھے۔ تقسیم کے بعد جالندھر مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اب دوبارہ کچھ مسلمان یہاں آ کر آباد ہوئے ہیں۔ حفیظ جالندھری کا نام کافی مشہور ہے۔ انہوں نے شاہنامۂ اسلام لکھی تھی جو ایک زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بہت مقبول ہوئی۔ میں نے سوچا کہ ''شاہنامۂ اسلام'' کی قسم کی کتابیں تو بہت سے مسلمانوں نے لکھیں۔ مسلمانوں کی ہر زبان میں اس قسم کی کتابیں کثرت سے ملتی ہیں مثلاً عربی میں فتوح الشام، وغیرہ۔ مگر ''دعوت نامۂ اسلام'' شاید کسی بھی مسلمان نے نہیں لکھی۔ نہ اردو میں اور نہ دوسری کسی زبان میں۔ دعوت کے موضوع پر واحد قابل ذکر کتاب ایک برطانی اسکالر پروفیسر ٹامس آرنلڈ (Thomas Arnold) کی ہے۔ ساڑھے چار سو صفحہ کی اس کتاب کا نام پریچنگ آف اسلام (The Preaching of Islam) ہے۔ وہ پہلی بار لندن سے ۱۸۹۶ میں شائع ہوئی تھی۔

اس کتاب کو حال میں نئی دہلی کے ایک پبلشنگ ادارہ گڈ ورڈ بکس (Goodword Books) نے زیادہ بہتر گٹ اپ (getup) کے ساتھ چھاپا ہے۔ اس کتاب کا موجودہ نام یہ ہے:

The Spread of Islam in the World

آج کا ٹائمس آف انڈیا (۱۶ ستمبر ۲۰۰۰) دیکھا۔ اس کے صفحۂ اول پر واشنگٹن کی ڈیٹ لائن

کے ساتھ دلیپ پیڈ گاؤ کر کی لکھی ہوئی ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ واشنگٹن میں اٹل بہاری واجپئی کی موجودگی میں امریکی صدر کلنٹن نے ایک تقریر کی۔ انہوں نے انڈیا کو ایک ابھرتی ہوئی اقتصادی طاقت قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ انفارمیشن ٹکنالوجی میں حیرت ناک ترقی کر رہا ہے:

He saluted India as a ''rising economic leader, making breath-taking strides in information technology.

اس کو پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ ہندستان کو اس ''حیرتناک ترقی'' تک کس نے پہنچایا۔ یقینی طور پر اس ملکی حکومت نے نہیں جو بے شمار قربانیوں کے بعد ۱۹۴۷ میں قائم ہوئی تھی۔ اس حکومت نے تو سوشلزم کے نام پر وہ چیز قائم کی جس کو راج گوپال اچاری لائسنس پرمٹ راج کہا کرتے تھے۔ لائسنس اور پرمٹ نظام نے ملک کی اقتصادیات کو صرف تباہ کرنے کا کام کیا ہے۔

ملک کی یہ خوش قسمتی تھی کہ نام نہاد پبلک سیکٹر کے ساتھ پرائیویٹ سیکٹر کو بھی زندہ رہنے کا موقع مل گیا۔ یہی پرائیویٹ سیکٹر ہے جس نے ملک کو اس ترقی سے ہم کنار کیا۔ ورنہ جہاں تک نام نہاد پبلک سیکٹر کا تعلق ہے اس نے تو ۵۰ سال کے دوران صرف دو منفی کارنامے انجام دئے ہیں — پہلے تو ملک کی دولت کو سمیٹ کر غیر نفع بخش کاموں میں انوسٹمنٹ (investment)، اور پھر اس غیر نفع بخش سرمایہ کاری کا ڈس انوسٹمنٹ (disinvestment)۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کسی چیز سے سبق لینے میں سب سے بڑی چیز جو رکاوٹ بنتی ہے وہ یہ کہ آدمی کے اندر سبق لینے کا ذہن موجود نہ ہو۔ دنیا میں بے شمار چیزیں موجود ہیں جو اپنے ساتھ نصیحت اور سبق کا دفتر لئے ہوئے ہیں۔ مگر آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہیں یا تو وقتی تفریح سے دلچسپی ہے یا مادی انٹرسٹ سے۔ کسی کے اندر یہ جذبہ ہی نہیں کہ وہ چیزوں سے سبق لے۔ جب لوگوں کا مزاج ایسا ہو تو اس کے بعد یہی ہوگا کہ نصیحت اور سبق کے ہجوم میں بھی وہ نصیحت اور سبق لینے سے محروم رہیں گے۔

۱۶ ستمبر کو میں جالندھر میں تھا۔ صبح کو اول وقت فجر کی نماز پڑھنے کے بعد گیسٹ ہاؤس کے باہر نکلا۔ اور اس کے وسیع لان میں ٹہلنے لگا۔ صبح کا سہانا سماں تھا۔ لان کی گھاس سبز فرش کی مانند دکھائی دے

رہی تھی۔ جگہ جگہ ہرے درخت کھڑے ہوئے تھے اسی کے ساتھ چڑیوں کی آوازیں اور کھلا ماحول، ان چیزوں نے پورے ماحول کو پرتاثیر بنادیا تھا۔ اس قسم کا قدرتی ماحول میرے لئے ہمیشہ ربانی انسپریشن (inspiration) کا ذریعہ ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھلے ماحول میں گھاس کے اوپر نماز پڑھنا پسند فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد آیتیں اور حدیثیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ روحانی انسپریشن کا سب سے بڑا ذریعہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے۔ یہ فطرت خدا کی صفات کمال کا تعارف کراتی ہے۔ اگر آدمی کے اندر اخذ کا مادہ بیدار ہو چکا ہو تو فطرت کی پوری دنیا آدمی کے لئے ربانی تربیت کا ذریعہ بن جائے گی۔

ایک تعلیم یافتہ سکھ سے ملاقات ہوئی۔ وہ سکھ دھرم کو سب سے اونچا دھرم سمجھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ سکھ دھرم میں جو کھلا پن ہے وہ کسی اور دھرم میں نہیں۔ اس کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اسلام کو دیکھئے۔ وہاں یہ حال ہے کہ کوئی نان مسلم کعبہ کی مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا۔ وہاں صرف مسلمان ہی جاسکتا ہے۔ جب کہ سکھوں کا سب سے مقدس استھان دربار صاحب (امرتسر) ۲۴ گھنٹہ ہر ایک کے لئے کھلا رہتا ہے۔ وہاں کسی کے جانے پر کوئی پابندی نہیں۔ ہر مذہب کا آدمی ہر وقت وہاں جاسکتا ہے۔

میں نے کہا کہ کسی مذہب کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لئے یہ کوئی صحیح معیار نہیں کہ یہ دیکھا جائے کہ وہاں کتنا کھلا پن ہے اور کتنا کھلا پن نہیں۔ کسی لبرل ادارے میں آپ جائیں تو وہاں اور بھی زیادہ کھلا پن نظر آئے گا حالانکہ وہ لوگ مذہب کو مانتے ہی نہیں۔ مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ اس کی تعلیمات کتنی زیادہ مبنی برصداقت ہیں۔ اس سے وابستہ شخصیتیں تاریخی ہیں یا غیر تاریخی۔ اس کی مقدس کتاب میں تحریفات ہوئی ہیں یا ابھی تک وہ غیر محرف حالت میں باقی ہے۔ اس کی تعلیمات علمی جانچ (scientific scrutiny) پر پوری اترتی ہیں یا نہیں۔ زندگی کے مختلف معاملات میں اس کے پاس رہنمائی کی کیا اسکیم ہے۔ انسان کی مجموعی ترقی کے لئے اس کی

تعلیمات کس حد تک کارآمد ہیں۔ وہ انسان کے ذہنی اور عقلی ارتقاء کا ساتھ دیتا ہے یا نہیں۔ اس کا جو ابتدائی ماخذ (source) ہے وہ کس حد تک قابل اعتبار (credible) ہے۔

ایک پروفیسر صاحب نے کہا کہ میں نے آپ کی تحریریں پڑھی ہیں آپ اسلام کو ایک پرامن مذہب کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر عام طور پر اس کی جو تصویر ہے اس کے مطابق، تو اسلام ایک تشدد کا مذہب ہے۔ کیوں کہ اسلام میں سب سے بڑی عبادت جہاد بتائی گئی ہے۔ ایسی حالت میں آپ اسلام کو امن کا مذہب کیسے کہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی باتیں صرف غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ سال میں اترا۔ اس ۲۳ سالہ مدت کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک حصہ تقریباً ۲۰ سال کی مدت تک پھیلا ہوا ہے اور اس کا دوسرا حصہ تقریباً ۳ سال پر مشتمل ہے۔ ۲۰ سال وہ ہیں جب کہ وہاں معتدل حالات تھے۔ اس مدت میں قرآن کی عمومی تعلیمات اتریں۔ یہ سب کی سب براہ راست یا بالواسطہ طور پر امن کے اصول سے تعلق رکھتی ہیں۔

تین سالہ دور وہ ہے جب کہ مسلمانوں پر متشددانہ حملہ کیا گیا۔ اور مسلم معاشرہ میں جنگ کی حالت (state of war) قائم ہوگئی۔ اس زمانہ میں جو احکام اترے وہ ایسے احکام تھے جو ہنگامی حالات میں دئے جاتے ہیں۔ اس طرح کے ہنگامی حالات میں ہر مذہب اور ہر سوسائٹی کو وہ احکام دئے جاتے ہیں جو دفاع کی وقتی ضرورت پر مبنی ہوتے ہیں۔ جو لوگ اسلام کو تشدد کا مذہب ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کرتے ہیں کہ ۳ سال کی ہنگامی مدت میں قرآن کی جو آیتیں اتریں ان کو ان کے سیاق (context) سے ہٹا کر انہی کو قرآن کی اصل تعلیمات قرار دے دیتے ہیں۔ یہ گویا استثناء (exception) کی تعمیم (generalisation) ہے، جو کسی بھی سسٹم کو سمجھنے کے لئے درست اور منصفانہ طریقہ نہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ مسلمان اپنے سوا دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان سے نفرت کرتے ہیں اور اس کا سبب خود اسلام کی تعلیمات ہیں۔ قرآن کے مطابق، مسلمانوں کے سوا جو لوگ ہیں وہ سب

کے سب کافر ہیں۔ مسلمان ان کو کافر کہتے ہیں۔ اس قسم کے عقیدہ کا نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کو دوسروں کے بارے میں نفرت اور حقارت پیدا ہو جائے۔

میں نے کہا کہ کافر کا یہ مطلب نہیں۔ کافر کا لفظی مطلب ہے انکار کرنے والا۔ اور یہ مسلمان کا کلمہ نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا کلمہ ہے۔ قرآن میں جہاں بھی کافر کا لفظ آیا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے نہ کہ مسلمانوں کی طرف سے۔ ''ایھا الکافرون'' خدا کا قول ہے۔ خود پیغمبر نے کبھی ایھا الکافرون کے لفظ سے خطاب نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اے لوگو، اے میری قوم، اے انسانو، جیسے الفاظ سے خطاب کیا۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی کو کافر کہے یا اس کے کافر ہونے کا اعلان کرے۔ یہ بہت بڑی جسارت ہے اور اپنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ تمام تر خدا کا کام ہے کہ وہ اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر کسی کو کافر (منکر) قرار دے۔ کسی کے کافر (منکر) ہونے کا تعلق دو چیزوں سے ہے۔ ایک یہ کہ اس پر اتمام حجت کیا جا چکا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ وہ فی الواقع سمجھ بوجھ کر انکار کی روش پر قائم رہے۔ ان دونوں باتوں کا حقیقی علم صرف خدا کو ہے۔ اس لئے صرف خدا ہی کو یہ حق ہے کہ وہ کسی کو کافر قرار دے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کے بارے میں یہ اعلان کرنا کہ وہ کافر ہے یہ خدا کے خصوصی اختیار کی بات ہے۔ کوئی مسلمان اگر ایسا کرے تو ایک حدیث کے مطابق، یہ اندیشہ ہے کہ وہ خود اس چیز کا مجرم بن جائے جس کا الزام وہ دوسروں کو دے رہا تھا۔

کون شخص حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے، اس کا اعلان کرنے کا حق صرف خدا کو ہے۔ مسلمان کی ذمہ داری آخر وقت تک صرف یہ ہے کہ وہ دعوتی عمل کے ذریعہ خدا کے پیغام کو لوگوں تک پہنچائے۔ اس کے بعد لوگوں کے انجام کا فیصلہ کرنا صرف خدا کی ذمہ داری ہے۔ کسی بھی دوسرے شخص کو اس کا حق حاصل نہیں۔ اس معاملہ میں اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے بارے میں کافر ہونے کا اعلان کرے تو گویا کہ یہ خدا کی عمل داری (Jurisdiction) میں داخل ہونا ہے۔ جو بذات خود ایک سنگین جرم ہے۔ خدا سے ڈرنے والا کوئی انسان اس کی جرأت نہیں کرسکتا۔

ایک تعلیم یافتہ سردار نے کہا کہ اسلام میں عورت کو مرد کے مقابلہ میں دوسرے درجہ پر رکھا گیا

ہے۔اس کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عدالتی گواہی کے معاملہ میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ دوعورت کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے(البقرہ ۲۸۲)۔

میں نے کہا کہ یہ کمتر درجہ(degradation) کی بات نہیں ہے بلکہ ایک فطری حقیقت کا لحاظ کرنے کی بات ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بوجھ اٹھانا ہوتو یہ کہا جائے کہ جوان آدمی ہوتو ایک ہی آدمی اس کو اٹھانے کے لئے کافی ہے اور اگر بوڑھا آدمی ہوتو دوآدمی اس کو اٹھانے کے لئے درکار ہوں گے۔ یہی معاملہ مذکورہ قانون کا ہے۔طب اور حیاتیات اور نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عورت اور مرد کی بناوٹ میں بے حد بنیادی فرق ہے۔مرد عام طور پر سال بھر یکساں حالت میں رہتا ہے۔جب کہ عورت پر مختلف فطری اسباب سے داخلی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔جس کی وجہ سے اس کی یادداشت متاثر ہوتی ہے۔ اس کے اندر جھنجھلاہٹ آجاتی ہے۔ اکثر وہ جذباتی ہو جاتی ہے۔کسی واقعہ کو ترکیز (concentration) کے ساتھ دیکھنااس کے لئے مشکل ہوجاتا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی عورت کے مزاج کے خلاف ہے کہ وہ کامل خاموشی کے ساتھ کسی خارجی واقعہ کا معائنہ کرے۔اس قسم کے فطری فروق(differances) کی بنا پر ایسا کیا گیا کہ گواہی کے لئے ایک مرد کی جگہ دوعورت کو مقرر کیا گیا تا کہ،خود قرآن کے الفاظ میں،ایک عورت کے بیان میں کچھ کمی ہوتو دوسری عورت اس کی تلافی کردے۔(البقرہ ۲۸۲)

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہمارے علماء عام طور پر تنقید اور اختلاف کو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ ہمارے تمام دینی اداروں میں تنقید کو ایک امر ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات علماء اور طلبہ دونوں کے لئے سخت مضر ہے۔کیوں کہ اس کی وجہ سے ذہنی ترقی کا عمل (process) رک جاتا ہے۔میں نے کہا کہ ۱۵ ستمبر ۲۰۰۰ کو گرونانک یونیورسٹی کے اجتماع میں میرا سامنا(encounter) اساتذہ اور تعلیم یافتہ لوگوں سے ہوا جو تقریباً سب کے سب غیر مسلم تھے۔میری تقریر کے بعد ان لوگوں نے''بوچھاڑ'' کے انداز میں اسلام پر اپنے اعتراضات پیش کرنا شروع کردئے۔ یہ میرے لئے ایک غیر متوقع صورت حال تھی۔کوئی عام آدمی اس کو دیکھ کر یہ کہتا کہ دیکھو یہ لوگ اسلام کے خلاف اپنے دل

کا بخار نکال رہے ہیں۔مگر میرا مزاج خدا کے فضل سے اس قسم کا نہیں ہے۔

میں ہر سوال کو خالص علمی سوال کے طور پر لیتا ہوں، اس کو نیت کا مسئلہ نہیں بناتا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تیز وتند سوالات نے خود میرے ذہن کو کھول دیا۔اسلام کے خلاف اعتراضات کی زیادہ معقول اور موثر وضاحت میری سمجھ میں آ گئی۔ چنانچہ پروگرام کے بعد مختلف حاضرین نے کہا کہ آپ کے جوابات سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں اور اسلام کے بارے میں ہماری غلط فہمیاں دور ہوئیں۔

پنجاب کے سفر میں ایک بات یہ سمجھ میں آئی کہ مذاہب میں بعد کے زمانہ میں بگاڑ کس طرح آتا ہے۔سکھ دھرم تقریباً ۵۰۰ سال پہلے وجود میں آیا۔اس کے بانی گرونانک تھے۔اس کے بعد ان کے درمیان کئی گرو پیدا ہوئے۔ان کے آخری گرو گوبند سنگھ تھے۔انہوں نے اعلان کیا کہ اب میرے بعد کوئی گرو نہیں ہوگا۔آئندہ کے لئے انہوں نے کہا کہ سب سکھن کو حکم ہے گرو مانیو گرنتھ۔

دسویں گرو کے اس قول کا مطلب بظاہر یہ تھا کہ آئندہ تمہیں کسی کو گرو نہیں ماننا ہے بلکہ اسی کتاب (گرنتھ) سے اپنے لئے رہنمائی حاصل کرنا ہے۔اس کو پڑھتے رہو اور اس کی باتوں پر عمل کرتے رہو۔مگر بعد کو کچھ لوگوں نے دسویں گرو کے الفاظ کی خود ساختہ تشریح کر کے اس کو یہ معنی دے دیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ گرو گرنتھ صاحب کی حیثیت ہی اب ہمارے لئے زندہ گرو کی ہے۔اس خود ساختہ تشریح سے زندہ گرو (living guru) کا تصور پیدا ہوا۔حتی کہ کتاب (گرنتھ) کے ساتھ وہ رسوم ادا کی جانے لگیں جو ایک زندہ شخصیت کے ساتھ کی جاتی ہیں۔مثلاً پنکھا جھلنا، پالکی میں یہاں سے وہاں لے جانا، وغیرہ۔

اسی قسم کی صورتیں ہر مذہب میں پیش آئیں، حتی کہ خود اسلام میں بھی۔مگر اسلام کے متن کو اللہ نے کامل طور پر محفوظ کر دیا ہے۔اس لئے بعد کے زمانہ میں کسی کے لئے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ خود متن میں کوئی تحریف کرے، البتہ تشریح میں بار بار اس قسم کی جسارت کی گئی۔

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ پہلے فرمایا تھا کہ ترکت فیکم

الثقلین (میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزوں کو چھوڑ رہا ہوں) اس حدیث میں ثقلین سے مراد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ تھی۔ مگر کچھ لوگوں نے اس کو اپنے ذہن کے مطابق ڈھال کر اس کو کتاب اللہ وعطرتی (اللہ کی کتاب اور میرا خاندان) بنا دیا اور اس طرح خودساختہ طور پر خاندان نبوت کو وہ درجہ دے دیا جو اللہ کی کتاب کا درجہ تھا۔

۱۵ ستمبر کی شام کو جالندھر میں صوفیانہ پروگرام (صوفی سانگ) تھا۔ اس پروگرام کے لئے پنجاب کے مشہور وڈالی برادرس (Wadali Brothers) کو بلایا گیا تھا۔ یہ ایک ٹیم تھی جو نہایت ماہر قسم کے پیشہ ور لوگوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے باجا اور گانا اور ایکٹنگ کے ذریعہ صوفیانہ تصورات اور صوفیانہ قصوں کا پروگرام پیش کیا۔ لوگ بار بار تالیاں بجا رہے تھے۔ مگر یہ روحانی پروگرام میرے لئے صرف ایک روحانی اذیت تھا۔ مجھے اس سے روحانی غذا ملنے کے بجائے روحانی تکلیف ملی۔

جالندھر میں امر اجالا کے کرسپانڈنٹ مسٹر نظام علی نے اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ کشمیر میں جو ٹررزم چلا آ رہا ہے اس کو اسلامی جہاد کہا جاتا ہے۔ یہ تو کشمیریوں کی اپنی مانگیں ہیں، اس کے لئے یہ لڑائی ہو رہی ہے۔

میں نے ان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں کشمیر کی لڑائی کو ایک قومی لڑائی سمجھتا ہوں، میں اس کو اسلامی جہاد نہیں سمجھتا۔ یہ ملک و مال کی لڑائی ہے اور اسلامی جہاد اللہ کے راستہ میں ہوتا ہے ملک و مال کے لئے نہیں۔ ایک اور سوال کے تحت انہوں نے کہا کہ دینی مدارس اپنی موجودہ شکل میں بے فائدہ ہو گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان مدارس کو ماڈرنائز کیا جائے اور ان میں جدید علوم اور جدید ہنر کو داخل کیا جائے۔

میں نے کہا کہ مدارس کے اندر اس قسم کی تبدیلی سے میں متفق نہیں ہوں۔ مدارس کو صرف دینی تعلیم کے لئے خاص ہونا چاہئے۔ موجودہ زمانہ میں مدارس کے اندر جو کمی آئی ہے وہ یہ ہے کہ اب ان میں ویسی گہری تعلیم نہیں ہوتی جیسی ہمارے زمانہ میں ہوتی تھی۔ مدارس کے سلسلے میں اصل کام ان کے تعلیمی معیار کو بڑھانا ہے نہ کہ ان کے نصاب میں جدید مضامین کو داخل کرنا۔

ایک سوال یہ تھا کہ بھاجپا کے صدر نے کہا کہ میں مسلمانوں کو جوڑنے کی کوشش کروں گا۔مگر مسلمان کہتے ہیں کہ یہ ایک جھانسا ہے، مسلمانوں کے خلاف ایک چال ہے۔

میں نے کہا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔اسلام ہمیشہ امن کے حالات میں ترقی کرتا ہے۔اس کی تمام تعلیمات امن پسندی کے اصول پر مبنی ہیں۔چنانچہ قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر تمہارے دشمن امن کے لئے جھکیں تو تم بھی اس کے لئے جھک جاؤ۔اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔(الأنفال ٦١) قرآن کی اس تعلیم کے مطابق، ہمیں ان کی پیش کش کو رد کرنے کے بجائے ان سے ڈائیلاگ کرنا چاہئے۔اور مسلمانوں کی جو معقول مانگیں ہیں وہ ان کے سامنے رکھنا چاہئے۔پھر دیکھنا چاہئے کہ وہ اپنی پیش کش میں کتنے سنجیدہ ہیں۔

ایک سوال یہ تھا کہ پچھلے ۵۰ سالوں میں سروس میں مسلمانوں کا تناسب (ratio) بہت گھٹ گیا ہے۔اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اصل مسئلہ ملازمتوں میں کمی کا نہیں ہے بلکہ تعلیم میں کمی کا ہے۔۱۹۴۷ میں مسلم ملازمین کثرت سے پاکستان چلے گئے۔اس کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمان محنت کر کے تعلیم میں آگے بڑھیں، پھر دھیرے دھیرے پچھلا تناسب دوبارہ قائم ہو جائے گا۔

جالندھر کے ایک ہندی اخبار کے نمائندہ مسٹر رنجیت سنگھ نے مجھ سے ملاقات کی اور اپنے اخبار کے لئے تفصیلی انٹرویو لیا۔انہوں نے مختلف قسم کے ملی اور ملکی سوالات کئے۔ایک سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کے جو مدرسے ہیں وہ وقت کی ضرورت کو پورا نہیں کرتے۔کیا آپ کے نزدیک ان کو ماڈرنائز کرنے کی ضرورت ہے۔یعنی ان مدرسوں میں کمپیوٹر اور نئے علوم پڑھائے جائیں۔میں نے کہا کہ میں اس سے متفق نہیں ہوں کہ مدارس کو ماڈرنائز کیا جائے۔میں نے کہا کہ ہر کمیونٹی کی ایک ضرورت یہ ہوتی ہے کہ اس کے درمیان مذہبی علماء کا ایک طبقہ ہو جو مذہبی اعتبار سے ان کو صحیح رہنمائی دیتا رہے۔اس مقصد کے لئے ہندوؤں میں پاٹھ شالائیں اور عیسائیوں میں سمینریز (seminaries) ہوتی ہیں۔اسی طرح مسلمانوں میں مدارس ہیں۔میں نے کہا کہ سیکولر تعلیم بلاشبہہ ضروری ہے مگر اس کا

انتظام الگ اداروں میں ہونا چاہئے نہ کہ مدرسوں میں۔

انہوں نے کہا کہ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مدارس کی موجودہ حالت پر مطمئن ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ میں بلاشبہہ مدارس میں ''اصلاح'' کی ضرورت محسوس کرتا ہوں مگر میرے نزدیک مدارس میں جس اصلاح کی ضرورت ہے وہ یہ نہیں ہے کہ اس میں ماڈرن علوم پڑھائے جائیں۔ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ خود قدیم علوم کی تعلیم کو زیادہ بہتر بنایا جائے تا کہ مدارس میں صاحبِ استعداد علماء پیدا ہوں۔

جہاں تک دنیوی علوم کا تعلق ہے، وہ بھی بلاشبہہ ضروری ہیں۔ مگر اس کی صورت یہ نہیں کہ خود ان علوم کو مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہاں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو مشہور انگریزی مقولہ ــــــــ ہر چیز کا جانکار، ماہر کسی چیز کا نہیں (Jack of all master of none) کے مصداق ہوں گے۔ اس لئے زیادہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو طلبہ اس قسم کا ذوق رکھتے ہیں وہ دوارنِ تعلیم یا بعد از تعلیم سیکولر اداروں سے ربط قائم کر کے علوم دنیوی میں ضروری تربیت حاصل کریں۔

دینی تعلیم کے اعتبار سے موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ آج ہمارے مدارس میں ایسے افراد پیدا نہیں ہو رہے ہیں جو دینی علوم پر ماہرانہ انداز میں رائے دے سکیں جب کہ مدارس کا اصل مقصد یہی ہے۔ مسلم دنیا میں ایسے لوگوں کی شدید قلت ہے جن کی طرف دینی علوم کے معاملہ میں پُر اعتماد طور پر رجوع کیا جائے۔ جو قرآن، حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ، عربی ادب، وغیرہ موضوعات پر گہری بصیرت رکھتے ہوں اور واقف کارانہ رائے دے سکیں۔ یہ مسلم دنیا کا سب سے زیادہ سنگین بحران ہے۔ مدارس کو ماڈرنائز کرنے سے یہ بحران ختم نہ ہوگا، بلکہ وہ موجودہ مدارس کو مستحکم کرنے سے ہوگا۔

موجودہ زمانہ میں مدارس کے پاس وسائل کی کمی نہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ہر مدرسہ جو پہلے ''تعلیمی جھونپڑے'' کی حیثیت رکھتا تھا آج وہ عمارتی اعتبار سے ''تعلیمی محل'' کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے مدارس کو زیادہ بامعنیٰ بنانے کے لئے اصل ضرورت یہ ہے کہ اس کے علمی معیار کو بڑھایا

جائے۔نہ یہ کہ اس کے نصاب کو بدلا جائے۔

اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے جب میں ایک عربی مدرسہ میں پڑھ رہا تھا، اس وقت وہاں جو اعلیٰ علمی ماحول تھا وہ آج کے عربی مدارس میں نظر نہیں آتا۔ اس وقت مدارس میں ایسے اساتذہ ہوتے تھے جو اپنے شعبہ علم میں گہری مہارت رکھتے تھے۔ ان کا جذبہ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ مسلسل طور پر طلبہ کی علمی نگرانی کرتے تھے اور زیادہ سے زیادہ وقت دے کر ان کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔

جالندھر میں میرا قیام ڈاکٹر امبیڈکر ریجنل انجینئرنگ کالج میں تھا۔ یہ ادارہ دس سال پہلے ۱۵۳ ۔ایکڑ رقبہ میں قائم کیا گیا۔ وہ سائنسی اور ٹکنکل تعلیم کے لئے مخصوص ہے۔

۱۶ ستمبر کو کالج کے ہال میں میری ایک تقریر ہوئی۔ اس تقریر کا موضوع تھا روحانیت۔ میں نے اپنی مفصل تقریر میں بتایا کہ روحانیت کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ روحانی ساز یا روحانی نغمہ سے محظوظ ہوں اور اس سے آنندلیں۔ روحانیت کوئی خارجی چیز نہیں۔ وہ خود انسان کے اندر چھپا ہوا ایک فطری جذبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص ایک لطیف ساز چھیڑتا ہے یا کوئی شخص روحانی نغمہ چھیڑتا ہے تو اپنے اندر چھپے ہوئے احساس کی بنا پر آدمی اس سے کیف محسوس کرنے لگتا ہے۔

اس قسم کا تجربہ بھی ایک مفید تجربہ ہے۔ کیوں کہ وہ آدمی کے غم کو بھلا دیتا ہے۔ اس سے آدمی کا ذہنی تناؤ (tension) دور ہو جاتا ہے۔ وہ بجائے خود ایک جائز چیز ہے مگر وہی اصل چیز نہیں۔

روحانیت کا اس سے بھی زیادہ بڑا ایک اور پہلو ہے۔ وہ تطبیق روحانیت (applied sprituality) ہے۔ یعنی روحانیت کو عملی زندگی میں اپنانا۔ روحانی قدروں (spiritual values) کو خارجی معاملات میں استعمال کرنا۔ روحانیت کا یہ دوسرا پہلو کامیاب انسانی زندگی کی تعمیر کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اول الذکر کا مطلب اگر روحانی شراب پینا ہے تو ثانی الذکر کا مطلب روحانیت کی بنیاد پر عملی زندگی کی تعمیر کرنا۔

تطبیقی روحانیت سے کیا مراد ہے، اس کی وضاحت کے لئے میں نے کئی مثالیں پیش کیں۔

مثلاً ایک شخص ایک صوفی سے ناراض ہو گیا۔ اس نے اس کو پتھر مار دیا۔ اس پر صوفی غصہ نہیں ہوئے بلکہ آگے بڑھ کر اس کو سینہ سے لگا لیا۔ آدمی نے کہا کہ میں نے تو آپ کو پتھر مارا اور آپ میرے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ صوفی نے کہا کہ تمہارے جیسے آدمی ہی کو تو سینہ سے لگانا ہے۔ کیوں کہ تمہارے اندر ایک برائی ہے۔ اس سلوک کا آدمی کے اوپر اتنا زیادہ اثر ہوا کہ آئندہ کے لئے وہ مستقل طور پر صوفی کا شاگرد بن گیا۔

یہی تطبیقی روحانیت ہے۔ نفرت کے جواب میں نفرت کرنا یا تشدد کے جواب میں تشدد کرنا ایک غیر روحانی عمل ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی نفرت کے جواب میں خیر خواہی کرے۔ اور تشدد کا جواب امن سے دے اس نے گویا روحانی قدروں کو عملی زندگی میں منتقل کیا۔ یہی کامیاب زندگی کا سب سے زیادہ یقینی فارمولا ہے۔

تقریر کے بعد لوگوں کو سوال کا موقع دیا گیا۔ حاضرین میں زیادہ تر نوجوان طلبہ تھے۔ ان کی طرف سے بہت سے سوالات کئے گئے۔ سوال کرنے والوں میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی۔ میں نے ہر سوال کا جواب مثبت انداز میں دیا۔ بعد کو لوگوں نے بتایا کہ لوگ میرے جواب سے پوری طرح مطمئن رہے۔

جالندھر میں میری تقریر کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ یہ ایک ونڈرفل تقریر تھی۔ میں اس کنفیوزن میں ہوں کہ کون سا مارگ سُپیریئر (superior) ہے۔ آپ نے جو چیزیں بتائی ہیں اس کو پریکٹکل روپ کیسے دیں۔ میں نے کہا کہ یہ مسئلہ ایک میٹنگ سے حل نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے آپ کو مزید مطالعہ کرنا چاہئے۔

ایک اور صاحب کے سوالات کے جواب میں میں نے کہا کہ پہلا کام یہ ہے کہ لوگوں میں شعوری بیداری (intellectual awakening) لائی جائے۔ اور ان میں روحانی ترقی (spiritual uplift) پیدا کی جائے۔ اس کے بعد ہی عملی طور پر کوئی بڑا کام کیا جاسکتا ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ اس وقت اسلام کے نام پر جو دھوم نظر آتی ہے وہ اسلام کے نام

پر پالیٹکس ہے۔اس کا حقیقی اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

میری تقریر کے بعد کالج کے پرنسپل نے اپنی اختتامی تقریر میں کہا کہ مولانا صاحب کی تقریر سے ہم سب لوگوں کو بہت فائدہ ہوا۔انہوں نے کہا کہ ہمارے نوجوانوں کے سامنے اس طرح بار بار مثبت پیغام پہنچنا چاہئے تاکہ وہ اپنی زندگی کو درست بنیادوں پر قائم کریں۔ پرنسپل نے کہا کہ مولانا صاحب نے عام فہم سطح (down to earth) پر ہمارے طالب علموں کو بہت اونچی باتیں سمجھا دیں۔ اور ہمارے کالج کی فضا میں اسپریچوالٹی (spirituality) بھرنے کی کوشش کی۔اور کہا کہ ہماری بنتی ہے کہ جب بھی انہیں سے ملے تو وہ ضرور ہمارے لئے ٹائم نکالیں۔

جالندھر سے دوبارہ سورن شتابدی اکسپریس کے ذریعہ دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ میرٹھ اور فرخ آباد سے تعلق رکھنے والے انجینئرنگ کے دو اسٹوڈنٹ اسٹیشن تک آئے۔ ان میں سے ایک طالب علم پہلے منفی ذہن رکھتا تھا۔اس نے جلسہ کے اندر بہت سے جارحانہ قسم کے سوالات کئے۔اللہ کی توفیق سے میں نے ہر سوال کا معتدل انداز میں جواب دیا۔آخر کار وہ اتنا متاثر ہوا کہ خود اپنے شوق سے مجھے پہنچانے کے لئے اسٹیشن آیا۔

میں سورن شتابدی اکسپریس کے اکیزیکیٹیو کلاس میں تھا۔اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ فطری وسائل جن کو استعمال کر کے یہ ٹرین بنائی گئی ہے۔وہ مسلمانوں کے ہزار سالہ اقتدار کے زمانہ میں بھی اس دنیا میں موجود تھے۔مگر ان کو واقعہ بنانے کا کام مغربی قوموں نے انجام دیا۔ یہ مغربی قومیں تھیں جنہوں نے پانی کو اسٹیم پاور میں تبدیل کیا، جنہوں نے لوہے کو اسٹیل میں تبدیل کر کے مشینیں بنائیں۔ جنہوں نے میٹر میں الکٹرسٹی کا راز دریافت کیا۔غرض جدید دور کی مادی ترقیاں سب کی سب مغربی قوموں کی دین ہیں۔

میں نے سوچا کہ مسلمان تقریباً ہزار سال تک عروج کی حالت میں تھے۔پھر وہ دنیا کو یہ چیزیں کیوں نہ دے سکے۔اس کو سوچتے ہوئے مجھے ایک اہم حقیقت سمجھ میں آئی۔وہ یہ کہ اس دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہو سکتی جو تنہا سب کچھ کر ڈالے۔اس لئے کہ یہاں عروج کے ساتھ زوال لگا ہوا ہے۔

جس طرح ایک فرد جوانی کے بعد بوڑھا ہوتا ہے اسی طرح ایک قوم عروج کے بعد زوال (degeneration) کا شکار ہوتی ہے۔اس حقیقت کو اقبال نے اس طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے:

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

اقبال نے کسی قوم کے زوال کا سبب تو بالکل درست لکھا ہے مگر عروج کے بارے میں ان کا نظریہ درست نہیں۔قرآن کے مطابق، کسی قوم کے عروج کا راز نفع بخشی (الرعد ۱۷) کی طاقت ہے نہ کہ شمشیر زنی کی طاقت۔اقبال کے شعر کو زیادہ صحیح طور پر اس طرح ہونا چاہئے:

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے تعمیر و عطا اول طاؤس و رباب آخر

مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار میں دنیا کو بہت سی ترقیاں دیں مگر ان کی تمام ترقیاں روایتی معنوں میں تھیں۔روایتی اعتبار سے انہوں نے ترقی کے عمل کو اپنی آخری حد تک پہنچا دیا۔

اس کے بعد انسانیت کو ترقی کے اگلے مرحلہ میں پہنچانا تھا۔یعنی روایتی ترقی کے دور سے نکال کر مشینی ترقی کے دور میں لے جانا۔ یہ کام مسلمان نہیں کر سکتے تھے۔ کیوں کہ روایتی ترقی کے دور کو آخری حد تک پہنچاتے پہنچاتے وہ اپنے زوال کے اس دور میں پہنچ چکے تھے جب کہ قومیں عیش و راحت میں مبتلا ہو کر قوت عمل کھو دیتی ہیں۔

عین اس وقت قانون فطرت (محمد ۳۸) کے تحت مسلمانوں کو غلبہ و اقتدار کے مقام سے ہٹا کر مغربی قوموں کو وہاں پہنچا دیا گیا۔اسی تبدیلی کا نتیجہ وہ تمام سائنسی ترقیاں ہیں جو آج ساری دنیا میں نظر آتی ہیں۔اگر ایسا ہوتا کہ زوال کے باوجود مسلمان ہی دنیا پر غالب رہتے تو جدید ترقیات کا دور سرے سے شروع ہی نہ ہوتا۔

تبدیلی کے اس عمل کو جو لوگ سازش اور ظلم کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں وہ صرف اپنی قومی خواہشات کو جانتے ہیں۔انہیں فطرت کے قانون کی خبر نہیں۔

۱۶ ستمبر ۲۰۰۰ کی رات کو گیارہ بجے ہماری ٹرین دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ٹرین کی جس کوچ میں میرا یہ سفر ہوا وہ مکمل طور پر ایر کنڈیشنڈ تھی۔ جب میں اس سے نکل کر باہر پلیٹ فارم پر آیا

تو اچانک یہاں اس کے بجائے گرم موسم تھا، ایک طرف ٹھنڈا اور دوسری طرف گرم کا یہ ماحول دیکھ کر مجھے قرآن کی آیت یاد آئی: باطنه فيه الرحمة و ظاهره من قبله العذاب (الحدید ۱۳)

ایک تفسیر کے مطابق، اس آیت میں رحمت اور عذاب کے الفاظ تعبیری طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہاں رحمت سے مراد مومنین کا نور ہے اور عذاب سے مراد منافقین کی ظلمت۔ (القرطبی، ۲۴۶/۱۷)

اس کے مطابق، آیت کا مطلب یہ ہے کہ مومن اور منافق کے درمیان جو چیز تفریق کرتی ہے، وہ یہ کہ مومن اپنے درست ذہن کی بنا پر حقیقتوں کو مثبت انداز میں دیکھتا ہے اور منافق اس کے برعکس حقیقتوں کو منفی انداز میں دیکھتا ہے۔ یہی فرق آخرت میں یہ صورت اختیار کرے گا کہ منافق عذاب میں گھر جائے گا اور مومن رحمتوں کے سائے میں رہے گا۔

۱۶ ستمبر ۲۰۰۰ کی رات کو میں واپس دہلی پہنچا۔